وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْآنِ مَا هُوَ شِفَاءٌ وَرَحْمَةٌ لِلْمُؤْمِنِينَ

قرآنِ مجید

ایک تعارف

ڈاکٹر محمود احمد غازی

دعوۃ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

قرآن مجید

ایک تعارف

ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ

دعوۃ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، فیصل مسجد، اسلام آباد

نام کتاب	:	قرآن مجید۔ایک تعارف
مصنف	:	ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ
نگران طباعت	:	عمران خٹک
سرورق	:	محمد طارق اعظم
حروف خوانی	:	محمد اشتیاق خاکی
طابع	:	ادارہ تحقیقات اسلامی پریس، اسلام آباد
اشاعت سوم	:	۲۰۱۳ء
تعداد	:	۳۰۰۰
قیمت	:	-/80 روپے

ISBN No. 969-556-076-6

ناشر

دعوۃ اکیڈمی

بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

فہرست

پیش لفظ

دینی، دعوتی اور تربیتی سرگرمیوں میں قرآن مجید کو ہمیشہ بنیادی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دعوۃ اکیڈمی کے پروگراموں میں خواہ وہ بچوں کے لیے ہوں یا اساتذہ کے لیے، خواتین کے لیے ہوں یا علماء کے لیے۔ قرآن مجید کے مختلف پہلوؤں پر لیکچر شامل ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ رمضان المبارک میں اعتکاف کے خصوصی پروگراموں میں بھی قرآن پاک پر گفتگو ہوتی ہے۔ ان پروگراموں میں مختلف اسکالر حضرات اظہار خیال کرتے ہیں۔ قرآن مجید ڈاکٹر محمود احمد غازی کی خصوصی دلچسپی کا موضوع ہے۔ اس پر وہ گہرے علمی لیکن انتہائی سہل انداز میں گفتگو کرنے کی خصوصی صلاحیت رکھتے ہیں جو شرکاء کے لیے ہمیشہ کشش کا باعث رہا ہے۔ دعوۃ اکیڈمی کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اسے ڈاکٹر غازی صاحب کی خدمات ہمیشہ حاصل رہی ہیں اور وہ بطور مربی مختلف پروگراموں کے شرکاء کو مستفید کرتے رہے ہیں۔

ہمیں مسرت ہے کہ ہم قرآن پاک کے تعارف پر مشتمل ان کے مضامین کو کتابی صورت میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ مضامین قرآن پاک کے تعارف کے سلسلے میں انتہائی سہل انداز میں مستند معلومات پر مبنی ہیں۔ یہ تحریریں فیصل مسجد کے معتکفین کے روبرو کی گئی وہ تقریریں ہیں جو ۱۹۹۰ـ۱۹۹۲ء میں کی گئیں اور حاضرین میں سے ایک صاحب نے انہیں ریکارڈر کی مدد سے ان کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کر لیا۔ اب یہ تقریریں

ضروری نظر ثانی کے بعد اشاعت کے لیے پیش کی جا رہی ہیں۔ کتاب کا عنوان ادارہ تجویز کردہ ہے لہذا اس کی ذمہ داری بھی ہماری ہے۔

قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی وہ کتاب پاک ہے جس کے مضامین اور جس کے اثرات نہ ختم ہونے والے ہیں۔ مسلمانوں کی دینی زندگی کا انحصار اس مقدس کتاب سے وابستگی پر ہے۔ اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسے پڑھا اور سمجھا نہ جائے۔ اسے پڑھنے اور سمجھنے کا شعور اس وقت تک بیدار نہیں ہو سکتا جب تک اس کی اہمیت کا احساس نہ ہو۔ اس کتاب میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید کے ناموں کی معنویت کیا ہے، قرآن پاک کا موضوع کیا ہے، قرآن مجید کا نزول کیسے ہوا، اس کی ترتیب کیا ہے اور قرآن مجید کی تدوین کیسے ہوئی۔ دین کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ قرآن مجید کے بارے میں یہ معلومات کتنی اہمیت کی حامل ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ کتاب عام قاری سے لے کر قرآن مجید کے سنجیدہ طالب علم تک کے لیے استفادہ کا باعث ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولف کو جزائے خیر دے اور دعوۃ اکیڈمی کو خدمت قرآن اور دعوت دین کے لیے اپنی برکتوں سے نوازے۔

ڈاکٹر ظفر [illegible]

قرآن مجید کے ناموں کی معنویت

دنیا میں ہر کتاب کا کوئی نام ہوتا ہے جس سے وہ جانی پہچانی جاتی ہے۔ قرآن پاک کا بھی ایک معروف نام "القرآن" ہے۔ جس کے حوالے سے یہ کتاب دنیا بھر میں جانی جاتی ہے۔ لیکن خود قرآن پاک میں اس کتاب کے کئی اور نام بھی دیئے گئے ہیں۔ ان میں سے چند نام ایسے نمایاں ہیں جن کا ذکر مختلف سورتوں میں اور مختلف آیات میں ملتا ہے۔ قرآن پاک کے بہت سے ناموں میں خاص طور پر یہ چار نمایاں نام اپنے اندر بڑی گہری معنویت رکھتے ہیں۔ یہ معنویت اتنی غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے کہ خود اس سے قرآن پاک کے معجزہ ہونے کے شواہد اور مثالیں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ یہ چار نام ہیں:

۱۔ القرآن

۲۔ الکتاب

۳۔ الفرقان

۴۔ الذکر

۱۔ القرآن

یوں تو دنیا کا ہر مصنف اپنی کتاب کا کوئی نہ کوئی نام رکھ ہی دیتا ہے لیکن دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہے کہ جس کا نام اس کتاب پر اتنا مکمل طور پر صادق آتا ہو کہ یہ کہا جا سکے کہ اس کتاب کے اس نام سے زیادہ کوئی نام اس کتاب پر صادق نہیں آ سکتا۔ یہ بات قرآن مجید کے علاوہ کسی کتاب کے بارے میں نہیں کہی جا سکتی۔ مثال کے طور پر مشہور کتاب "داس کیپیٹال" کارل مارکس کی لکھی ہوئی ایک معروف اور اہم کتاب ہے جس کا موضوع سرمایہ ہے۔ سب جانتے ہیں کہ سرمایے کے موضوع پر دنیا میں ہزاروں کتابیں ہوں گی۔ ممکن ہے ان میں سے بعض کتابیں کارل مارکس کی کتاب سے اچھی ہوں، اور فرض کریں اگر یہ سب کتابیں کارل مارکس کی کتاب سے اچھی نہ بھی ہوں اور یہ فرض کر لیں کہ ساری کتابیں اس سے کم درجے ہی کی ہوں گی جب بھی ان میں سے ہر کتاب کو سرمایے کے نام سے موسوم کیا جا سکتا ہے۔ جو کتاب بھی سرمایے کے موضوع پر ہے تو آپ اس کو "داس کیپیٹال" کہہ سکتے ہیں۔ اور کوئی شخص اس نام پر نہ اعتراض کر سکتا ہے نہ اس نام کو غلط قرار دے سکتا ہے۔ اس لیے اس نام میں کوئی ایسی خصوصی معنویت نہیں ہے جو کارل مارکس کی "داس کیپیٹال" کے علاوہ کسی اور کتاب میں نہ پائی جاتی ہو اور اس کی وجہ سے یہ نام اس موضوع کی کسی اور کتاب کے لیے آپ استعمال نہ کر سکیں۔

دیوان غالب کو لیجیے جو اردو ادب تو کیا عالمی ادب کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ لیکن دیوان غالب کے نام میں کیا معنویت ہے، کچھ نہیں۔ ہر وہ شاعر جس کا تخلص یا نام غالب ہو اپنے مجموعہ کلام کو دیوان غالب کے نام سے موسوم کر سکتا ہے۔ اس لیے کہ ہر صاحب دیوان شاعر کا دیوان ہوتا ہے جو اس کے نام سے معروف ہو جاتا ہے۔ اس میں نہ کوئی خاص بات ہے اور نہ کوئی منفرد انداز کی معنویت۔ دنیا میں ہزاروں ناکام شاعر

ہوئے ہیں، ہر شاعر کے مجموعہ کلام کو آپ اس کا دیوان کہہ سکتے ہیں۔ اس طرح سے آپ دیکھتے جائیں تو دنیا میں جتنی کتابیں ہیں ان کے نام کے بارے میں آپ یقین سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ نام اس کتاب کے علاوہ کسی اور کتاب پر صادق نہیں آتا۔ کسی کتاب کے بارے میں ایسا دعویٰ کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ صرف قرآن ایسا نام ہے جو صرف ایک ہی کتاب پر صادق آتا ہے اور اس کے علاوہ کسی بھی کتاب پر اس مفہوم میں اس منفرد نام کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

القرآن کے لغوی معنیٰ ہیں وہ تحریر جسے بار بار پڑھا جائے۔ لہٰذا بار بار پڑھی جانے والی چیز کو عربی زبان میں قرآن کہا جائے گا۔ پھر جب اس میں حرف تخصیص یعنی الف لام لگتا ہے تو اس میں مزید تخصیص پیدا ہو جاتی ہے یعنی "القرآن" اس اضافے سے اس میں یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ وہ واحد چیز جو بار بار کثرت اور تسلسل کے ساتھ پڑھی جارہی ہے اور اس کے علاوہ کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اتنے تواتر اور تسلسل سے پڑھی جارہی ہو۔ القرآن کا یہ لفظی مفہوم ذہن میں رکھیں۔

اس مفہوم کے بعد میں آپ کے سامنے ایک دعویٰ پیش کرتا ہوں اور اس دعوے کی ایک دلیل بھی آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ دعویٰ یہ ہے کہ قرآن پاک دنیا کی تاریخ میں واحد کتاب ہے جو گزشتہ چودہ سو سال سے روئے زمین پر اتنے تسلسل سے پڑھی جارہی ہے اور ہر وقت، ایک ایک وقت میں، بلکہ ایک ایک لمحے میں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں آدمی اس کو تسلسل اور تواتر سے اس طرح پڑھ رہے ہیں کہ اس تلاوت میں ایک سیکنڈ کے ایک ہزارویں حصے کا بھی وقفہ نہیں آتا۔ روئے زمین کا اگر نقشہ ہمارے سامنے ہو اور اس کو سامنے رکھ کر اس دعویٰ پر غور کیا جائے کہ چودہ سو برس سے لے کر اس لمحے تک اور آئندہ جب تک یہ دنیا موجود ہے ایک سیکنڈ کا وقفہ اس

روئے زمین پر ایسا نہیں آیا اور نہ آئے گا کہ لوگ کہیں نہ کہیں قرآن پاک کی تلاوت نہ کر رہے ہوں تو ذرا سا غور کرنے سے یہ حقیقت واضح اور مبرہن ہو جاتی ہے اور بیہ صاف سمجھ میں آ جاتا ہے کہ دنیا میں ایک لمحے کے لیے بھی کہیں ایسا نہیں ہوتا کہ تلاوت قرآن کریم کا سلسلہ منقطع ہو جاتا ہو۔ یہ محض دعویٰ نہیں ہے بلکہ اس کی دلیل خود آپ کے سامنے موجود ہے۔ روئے زمین پر ڈیڑھ ارب سے زائد مسلمان آباد ہیں۔ دنیا کے نقشے پر نظر ڈال کر دیکھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ روئے زمین کے جنوب مشرقی کونے میں فجی اور آسٹریلیا میں چار لاکھ سے زائد مسلمان آباد ہیں جو اکثر و بیشتر آسٹریلیا کے بالکل جنوب مشرق کے علاقے نیو ساؤتھ ویلز میں رہتے ہیں۔ جب فجی اور آسٹریلیا میں صبح کی نماز کا وقت ہوتا ہے اور یہ یاد رہے کہ دنیا میں صبح سب سے پہلے فجی اور آسٹریلیا ہی میں ہوتی ہے تو وہاں کے مسلمان کیا کرتے ہوں گے؟ آپ مان لیجیے کہ نماز پڑھنے والوں کا اوسط مسلمانوں میں بہت کم رہ گیا ہے۔ فرض کر لیں کہ مسلمانوں میں بہت سے لوگ لامذہب اور بے دین ہو گئے ہیں اور ان کا دین سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا ہے۔ کوئی مخالف زیادہ سے زیادہ یہی فرض کر سکتا ہے، لیکن اس حقیقت سے کوئی بڑے سے بڑا مخالف اسلام بھی اختلاف نہیں کر سکتا کہ مسلمانوں کی اتنی بڑی تعداد میں سے ایک چوتھائی یعنی پچیس فیصد لوگ ضرور نماز پڑھتے ہوں گے۔ اگر پچیس فیصد لوگ نماز پڑھتے ہوں تو گویا کم از کم ایک لاکھ مسلمان اس علاقے میں ایسے ضرور ہیں جو روزانہ علی الصباح فجر کی نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور کھڑے ہو کر قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں۔ مسلمانوں میں ہمیشہ سے یہ طریقہ چلا آ رہا ہے کہ وہ فجر کی نماز کے بعد بقدر توفیق قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں۔ مان لیجیے کہ اس وقت قرآن مجید کی تلاوت کرنے والے ان پچیس فیصد کے بھی دس فیصد ہیں تو پھر بھی کئی ہزار مسلمان وہ

ہیں جو قرآن پاک کھول کر تلاوت کر رہے ہوں گے اور جو باقاعدہ تلاوت نہیں کرتے وہ بھی کم از کم نماز میں سورۃ فاتحہ اور سورۃ اخلاص وغیرہ کی تلاوت ضرور کرتے ہیں۔ اول تو یہ تعداد لاکھوں میں ہے لیکن بڑے سے بڑا مخالف بھی چند ہزار کا اعتراف ضرور کرے گا اور نہیں کرتا تو آپ اسے فجی اور آسٹریلیا لے جا کر دکھا دیجئے۔

اس کے بعد جب آسٹریلیا میں فجر کا وقت ختم ہونے لگتا ہے تو انڈونیشیا میں فجر کی نماز کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ انڈونیشیا میں بیس کروڑ سے زائد مسلمان بستے ہیں۔ پورے ملک میں ساڑھے پانچ ہزار جزائر ہیں جو تین ہزار میل کے رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مشرق سے لے کر مغرب تک جزائر کا ایک لمبا سلسلہ آپ نقشے پر دیکھ لیجئے۔ اس بیس کروڑ کی آبادی میں اگر دس فیصد بھی نماز پڑھتے ہوں تو دو کروڑ مسلمان انڈونیشیا میں نماز پڑھتے ہیں اور چونکہ وہ تین ہزار میل میں پھیلا ہوا ہے تو پہلے مشرقی علاقے میں فجر کا وقت شروع ہوجاتا ہے۔ پہلے مشرقی جزائر میں فجر کی نمازوں سے اس سلسلے کا آغاز ہوتا ہے پھر وسطی جزائر میں پھر آخر میں مغربی جزائر میں۔ یاد رہے کہ انڈونیشیا کے مغربی جزائر ملائشیا کے ساتھ ایک ہی عرض بلد پر واقع ہیں۔ یوں فجر کا وقت ملائشیا اور انڈونیشیا میں بیک وقت شروع ہوجاتا ہے اور جوں ہی وہاں یہ سلسلہ ختم ہوتا ہے تو بنگلہ دیش میں شروع ہوجاتا ہے۔ بنگلہ دیش میں ختم ہوتے ہی بھارت میں شروع ہو جاتا ہے۔ جہاں بیس کروڑ کے لگ بھگ مسلمان رہتے ہیں۔

ابھی بھارت کے مسلمان فجر کی نماز پڑھ ہی رہے ہوتے ہیں کہ فجی میں ظہر کا وقت داخل ہوجاتا ہے اور وہ سلسلہ دوبارہ شروع ہوجاتا ہے۔ اب گویا دو سلسلے ہو گئے۔ کی رو سے زمین پر تلاوت قرآن پاک کی دو لہریں چل رہی ہیں۔ یہ دو لہریں یا سلسلے یا وہ Waves جو مشرق سے شروع ہو کر مغرب کو جاری ہیں۔ ہندوستان میں ابھی یہ ہر ختم

نہیں ہوتی کہ پاکستان میں شروع ہو جاتی ہے اور پاکستان کے بعد پورا وسطی ایشیا، پورا افغانستان، پورا چین جہاں کروڑوں مسلمان آباد ہیں اس لہر میں شامل ہو جاتے ہیں، اور یوں اس وسیع وعریض خطے میں تلاوت قرآن کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ پاکستان کے چودہ کروڑ میں سے اگر بیس فیصد مسلمان بھی قرآن پڑھتے ہوں تو کم و بیش ستر اسی لاکھ مسلمان پاکستان بھر میں فجر کے وقت تلاوت اور نماز میں مشغول ہوتے ہیں۔ اگر چہ یہاں تلاوت قرآن کرنے والوں کی اصل تعداد اس سے بہت زیادہ ہے۔ جب نماز فجر کا یہ سلسلہ مصر تک پہنچتا ہے تو نجی میں عصر کا وقت داخل ہو چکا ہوتا ہے۔ اس طرح بہ یک وقت تین سلسلے شروع ہو جاتے ہیں، اور جب یہ سلسلہ آگے پہنچتا ہے اور مراکش میں داخل ہوتا ہے تو پیچھے نجی میں مغرب کا وقت داخل ہو جاتا ہے۔ اب چار سلسلے ہو گئے اور جب امریکہ میں جہاں نوے لاکھ سے زائد مسلمان رہتے ہیں فجر کا وقت داخل ہوتا ہے اور وہ فجر کی نماز پڑھنا شروع کرتے ہیں تو نجی میں عشا کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔ یوں روئے زمین پر نماز و تلاوت کے پانچ سلسلے ایسے چلتے رہتے ہیں جن میں چاروں طرف سے تسلسل قائم رہتا ہے۔ اس میں کبھی وقفہ نہیں ہوتا۔ اگر کسی کو شک ہو تو وہ ٹیلی فون کر کے معلوم کر سکتا ہے کہ دنیا میں کہاں کہاں اس وقت کون کون سی نمازیں ادا کی جا رہی ہیں اور کہاں کہاں تلاوتیں ہو رہی ہیں۔ یوں بھی دنیا کا نقشہ سامنے ہو، نمازوں کے اوقات اور دنیا میں مسلمانوں کی تعداد کا علم ہو اور سورج کی حرکت کا اندازہ ہو تو ٹیلی فون کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ نقشے سے پتہ چل جائے گا کہ چوبیس گھنٹے میں نماز و تلاوت کی ہر وقت پانچ رویں مسلسل اور متواتر چلتی رہتی ہیں اور روئے زمین پر کہیں نہ کہیں ہزاروں، لاکھوں مسلمان قرآن پاک کے کسی ایک حصے کی تلاوت یا سماعت کر رہے ہوتے ہیں۔

اس اعتبار سے اگر ہم یہ کہتے ہیں تو درست کہتے ہیں کہ القرآن وہ واحد کتاب ہے جس پر یہ لفظ اس کمال اور بھرپور طریقے سے صادق آتا ہے کہ کسی اور کتاب پر صادق نہیں آتا اور دنیا میں کوئی بھی کتاب ایسی نہیں جو اتنے تسلسل کے ساتھ اور اتنی کثرت کے ساتھ پڑھی جارہی ہو کہ اس میں چودہ سو سال سے کوئی وقفہ نہیں آیا ہو۔ وقفہ آہی کیسے سکتا ہے، اس تسلسل میں ایک منٹ یا ایک سیکنڈ کا وقفہ بھی اس لیے نہیں آسکتا کہ پانچ مدتیں متواتر چل رہی ہیں۔ لہٰذا القرآن ایسا نام ہے کہ یہ کسی اور کتاب پر پورا اتر ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اللہ رب العزت نے اپنی کتاب کے لیے نام بھی ایسا رکھا ہے کہ اس کتاب کے علاوہ کوئی اور کتاب ایسی نہیں ہے جو القرآن تو کیا قرآن بھی کہلا سکے۔ یہ نام قرآن پاک میں ۲۶ مرتبہ استعمال ہوا ہے۔

۲۔ الکتاب

دوسرا نام اس کتاب کا ''الکتاب'' ہے۔ وہ بھی بڑی اہمیت اور معنویت رکھتا ہے۔ اس نام کا اللہ رب العزت کی مجموعی اسکیم سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ انبیائے علیہم السلام کی اور نبوت کے سلسلے کی کتابیں بھیجے جانے اور شریعتیں اتارے جانے کی، اللہ تعالیٰ کی اسکیم سے اس نام کا بڑا گہرا تعلق ہے۔

قرآن کو بار بار الکتاب کہا گیا ہے۔ آغاز میں ہی ارشاد باری ہے:

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (۱)

یہ وہ الکتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔

ایک جگہ ارشاد ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰي عَبْدِهِ الْكِتٰبَ (۲)

سب تعریفیں اس اللہ کی جس نے اپنے بندہ پر الکتاب اتاری۔

الکتاب کے معنی ہیں "دی بک" (The Book)۔ جب انگریزی میں دی (The) اور عربی میں "ال" تخصیص کے حرف کے طور پر لگایا جاتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں معرف و متعین چیز جس کا تذکرہ ہے۔ یعنی وہ متعین کتاب جس کا اس سیاق و سباق میں تذکرہ ہو رہا ہے۔ لیکن اس کے باوجود کہ قرآن پاک نے بار بار خود کو الکتاب کہا ہے، اس کے ساتھ ساتھ قرآن پاک میں جیسا کہ ہر مسلمان جانتا ہے پچھلی کتابوں کا تذکرہ بھی ہے۔ تورات کا بھی ذکر ہے اور انجیل اور زبور کا بھی ذکر ہے۔ ان تین کتابوں کے تو نام لیے گئے ہیں۔ باقی کتابوں کا ذکر عمومی انداز میں ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ الاعلیٰ میں صحف ابراہیم و موسیٰ کا ذکر ہے۔ ارشاد ہے

إِنَّ هَٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ صُحُفِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ (۳)

یہی پیغام پرانے صحیفوں میں بھی ہے، ابراہیم کے صحیفوں میں بھی اور موسیٰ کے صحیفوں میں بھی۔

اب جہاں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں کا تعلق ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس سے خاص طور پر یعنی عہد نامہ قدیمہ کی پہلی پانچ کتابیں مراد ہیں جن کو تورات کہا جاتا ہے۔ اگرچہ تورات کو کہیں بھی قرآن میں صحیفے نہیں کہا گیا، اس لیے قطعی طور پر ہم نہیں کہہ سکتے کہ صحیفے جو یہاں کہا گیا ہے ان سے مراد تورات ہی ہے یا کوئی اور صحیفے مراد ہیں۔ غالب خیال البتہ یہی ہے اس سے تورات مراد ہو۔ لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے، جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی کچھ صحیفے یا کتابچے الگ الگ اجزاء سورتوں یا صفحوں کی شکل میں اتارے گئے تھے، جن کا قرآن پاک کی ان آیات میں ذکر ہے۔ یقیناً یہ صحیفے ان تین مشہور کتابوں کے علاوہ ہیں۔

قرآن مجید میں ایک جگہ پرانی کتابوں کا مجموعی انداز سے ذکر کیا گیا ہے :

وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ (۴)

اور یہی پیغام پہلے لوگوں کی (پرانی) کتابوں میں بھی بیان کیا گیا ہے۔

گویا کچھ اور قدیم اور پرانی کتابیں بھی ایسی تھیں جو اللہ نے پہلے اتاری تھیں جن کے ناموں اور مندرجات کی تفصیلات کا ہمیں علم نہیں۔ اس اجمال کی مزید وضاحت ایک روایت سے ہوتی ہے جو مسند امام احمد بن حنبل میں بیان ہوئی ہے۔ اس روایت میں یہ بیان کیا گیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک لاکھ چالیس ہزار پیغمبر بھیجے اور ان میں سے ۳۱۵ صاحب کتاب تھے۔(۵) اس طرح گویا کتابوں کی تعداد ۳۱۵ کے لگ بھگ تھی۔ لگ بھگ اس لیے کہا گیا کہ بعض کتابیں ایسی بھی ہیں کہ ایک سے زائد پیغمبروں کو دی گئیں۔ اس اعتبار سے کتابوں کی تعداد بہرحال سیکڑوں میں ضرور ہوگی۔ کتنی ہوگی یہ ہم قطعیت سے نہیں کہہ سکتے۔ قرآن پاک میں کئی جگہ ان کتابوں کا اجمالی ذکر آیا ہے اور ایک صاحب ایمان کے لیے ان سب کتابوں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہ ایمان رکھنا کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں اتاری ہیں چاہے ان کے نام ہمارے علم میں ہوں یا نہ ہوں، چاہے ان کی تفصیلات ہمارے علم میں ہوں یا نہ ہوں ہم ان سب پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی کتاب مانتے ہیں۔ یہ بات اسلامی عقیدے کا جز ہے، جس کو ماننا مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے۔

ان کتابوں کے لیے قرآن پاک میں دو الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ ان دونوں کی بڑی اہمیت ہے اور ان کا قرآن پاک کے اس نام ''الکتاب'' سے بڑا گہرا تعلق

ہے۔ ان سب کتابوں سے بچے جن کی تعداد تین سو چودہ کے لگ بھگ ہے۔ قرآن نا

پاک میں کئی جگہ کتب (کتابیں) کا لفظ بہ صیغہ جمع استعمال ہوا ہے۔ سورۃ البقرہ کی

آخری آیات میں ارشاد ہوتا ہے:

كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ (۲)

رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور سب دل ایمان لائے اللہ

کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے

ہیں۔

یہاں کتب (کتابیں، بہ صیغۂ جمع) سے مراد وہ کتابیں ہیں جو اللہ نے اتاری

ہیں، بشمول قرآن مجید۔ یہاں اللہ رب العزت نے کتب کا لفظ استعمال کیا ہے جو جمع

کے لیے ہے، یعنی بہت ساری کتابیں لیکن ایک دوسری جگہ پچھلی تمام کتابوں کے لیے

"الکتاب" کا لفظ (بہ صیغۂ واحد) استعمال کیا گیا ہے۔ سورۃ المائدہ میں جہاں قرآن

مجید کا تعارف کرایا گیا ہے وہاں فرمایا:

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (۷)

قرآن اپنے سے پہلے آنے والی کتب "الکتاب" کی تصدیق کرتا

ہے اور اس کا محافظ اور اس پر حاوی ہے۔

یہاں بھی دونوں صیغے مفرد کے ہیں۔ اگرچہ کتابیں جن کی طرف اشارہ مقصود

ہے بہت سی ہیں، الکتاب کا لفظ اور علیہ کی ضمیر دونوں صیغہ واحد میں استعمال ہوئے

ہیں۔ حالانکہ خود قرآن نے بہت سی کتابوں کا ذکر کیا ہے جن کی تعداد جیسا کہ ہم

نے دیکھا سینکڑوں میں ہے۔ پھر الکتاب اور علیہ دونوں مقام پر صیغہ مفرد کیوں استعمال

کیا گیا؟ اس میں کیا حکمت پوشیدہ ہے۔ یہ ایک سوال ہے کہ قرآن کو بھی الکتاب کہا گیا

اور پچھلی ساری کتابوں کو بھی مجموعی طور پر الکتاب کہہ گیا؟ آخر کیوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے اور یہ دونوں اپنی اپنی جگہ (صیغہ جمع میں الکتب کا لفظ ہو یا صیغہ واحد میں الکتاب کا لفظ ہو) درست ہیں۔ ان میں نہ کوئی تعارض ہے نہ کوئی تضاد بلکہ اس اسلوب بیان سے ایک چیز کے دو پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ اللہ رب العزت جو خالق کائنات ہے اس کا ارشاد ہے:

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ (۸)

میرے ہاں بات بدلی نہیں جاتی۔

جو بات اس نے پہلے دن کہہ دی تھی وہی بات اس نے بعد میں بھی کہی۔ جو تعلیم اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دی تھی وہی تعلیم حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی دی اور جو تعلیم حضرت عیسیٰ کو دی تھی وہی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی دی۔ لہذا اللہ کی تعلیم میں کبھی کوئی فرق نہیں ہوسکتا۔ اس نے پہلے دن بھی توحید کی تعلیم دی تھی، رسالت پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیا تھا اور آخرت پر ایمان کا سبق دیا تھا، مکارم اخلاق کی اور برے کردار سے بچنے کی تعلیم پہلے بھی دی تھی اور ان ہی چیزوں کی تعلیم آج بھی دی۔ تفصیلات میں جو فرق نظر آتا ہے وہ لوگوں کے اپنے حالات بدلنے کی وجہ سے ہے۔ جوں جوں انسانی تمدن نے ترقی کی، اسی لحاظ سے تعلیم کی تفصیلات میں اضافہ ہوتا رہا۔ لیکن دین کی جو بنیادی تعلیم روز اول تھی وہ ہر زمانے میں ایک ہی رہی ہے۔ اس اعتبار سے اللہ تعالیٰ نے جتنی کتابیں اتاریں ان سب کو آپ ایک کتاب کہہ سکتے ہیں۔ اس اعتبار سے کہ ان کا مصنف ایک، ان کا بنیادی پیغام ایک، ان کا مقصد ایک، کہ لوگ اچھے انسان بن جائیں، آخرت میں ان کو فلاح حاصل ہو اور وہ جہنم سے نجات پاکر جنت میں داخل ہو جائیں۔ ان سب کتابوں کے اتارے جانے کا یہی مقصد وحید

تھا۔ ان میں سے ہر کتاب کا سبق یہ تھا کہ انسان اللہ سے اپنا تعلق جوڑے، ایمان اختیار کرے، تقوے کا رویہ اپنائے، اور اعمال صالحہ پر کاربند ہو۔ اس اعتبار سے ان سب کتابوں کو "ایک کتاب" کہا جاسکتا ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ مثلاً ایک مصنف آج اردو میں ایک کتاب لکھتا ہے، جس میں وہ یہ بتاتا ہے کہ پاکستان کے باشندے اچھے انسان کس طرح بنیں، اچھا اخلاق ان میں کیسے آجائے، کردار کی تعمیر کیسے ہو وغیرہ وغیرہ۔ اس کتاب میں دلائل دیئے جاتے ہیں، مثالیں دی جاتی ہیں اور تعمیر کردار کا پیغام دیا جاتا ہے۔ فرض کیجئے وہ کتاب بہت مقبول ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ بیرون ملک بنگلہ دیش کے مسلمان مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کتاب کا ایک ایڈیشن ان کے لیے تیار کردیا جائے۔ اب یہ مصنف جو اتفاق سے بنگالی زبان بھی جانتا ہے، اس کتاب کے مضامین کو بنگالی زبان میں بھی شائع کراتا ہے۔ لیکن بنگالی ایڈیشن میں وہ مصنف ان مقامی حوالوں اور مثالوں کو بدل دیتا ہے، جن کا تعلق صرف پاکستانی معاشرے سے تھا اور پاکستانی لوگ ہی ان مثالوں کو سمجھ سکتے تھے۔ مثلاً پاکستانی ایڈیشن میں کسی سیاق و سباق میں تربیلا ڈیم کا ذکر ہوسکتا ہے لیکن بنگالی ایڈیشن میں اس سیاق و سباق میں تربیلا ڈیم کے بجائے فرخا ڈیم کا حوالہ لکھا ہوتا ہے جس سے وہ لوگ نسبتاً زیادہ مانوس ہیں۔ یہاں بلوچستان کے حوالے سے اگر اونٹوں کا ذکر ہے تو بنگالی ایڈیشن میں کشتیوں کی مثال دی جائے گی۔ اسی طرح یہاں کی مشہور شخصیتوں کے حوالوں کی جگہ بنگلہ دیش کی شخصیتوں کا حوالہ دیا جائے گا، جسے وہ لوگ بآسانی سمجھ سکتے ہیں۔

اسی طرح یہ کتاب ترکی کے لوگوں کے علم میں آئی اور انہوں نے مطالبہ کیا کہ اس کا ایک ایڈیشن ان کے لیے بھی شائع کردیا جائے۔ اب اس مصنف نے ترکی کے

حوالے، شخصیات اور مقامات کا ذکر کرکے وہ کتاب ترکی کے لیے تیار کردی۔ اب دیکھا جائے تو کتاب کا بنیادی پیغام کہ انسانوں کو کس طرح بہتر انسان بنایا جائے، تو ایک ہی ہے خواہ وہ پاکستانی ہوں، بنگالی ہوں یا ترک ہوں، بنیادی اخلاقی تعلیمات سب کے لیے ایک ہی ہیں۔ کتاب بھی ایک ہی ہے، پیغام بھی ایک ہے، اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ اس مصنف نے ایک کتاب لکھی اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس نے تین کتابیں لکھی ہیں، اس لیے کہ وہ تین مختلف علاقوں کے لیے تین مختلف زبانوں میں لکھی گئیں۔

قریب قریب یہی معاملہ، بلاتشبیہ، کتب سماویہ کا بھی سمجھنا چاہیے۔ اس اعتبار سے قرآن مجید نے ان ساری کتابوں کو کتابیں بھی قرار دیا اور ایک الکتاب بھی قرار دیا۔ الکتاب وہ سب اس اعتبار سے ہیں کہ ان کا بھیجنے والا ایک، ان کا پہنچانے والا ایک، ان کا بنیادی پیغام ایک، ان کا مقصد ایک، اور ان سے بالآخر جو نتیجہ نکلنے والا ہے وہ ایک ہے۔ اسی طرح ان کو الگ الگ کتابیں بھی قرار دیا گیا، اس اعتبار سے کہ وہ مختلف انبیاء علیہم السلام پر اتاری گئیں، مختلف زبانوں میں ان کو اتارا گیا، مختلف علاقوں میں ان کو اتارا گیا، مختلف اوقات میں اتارا گیا۔ ان اسباب کی بنیاد پر ان کو جداگانہ کتابیں بھی کہا جاسکتا ہے۔

اب آپ دیکھیے کہ قرآن مجید یہاں جب اپنے آپ کو الکتاب کہتا ہے تو وہ گویا دو باتیں کہتا ہے۔ ایک تو وہ یہی ایک بنیادی صفت کا تذکرہ کرتا ہے کہ اس وقت یہ اسی طرح کی الکتاب (The Book) ہے، جس طرح ایک زمانے میں تورات الکتاب تھی یا انجیل الکتاب تھی۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی مرضی کی واحد ترجمان اور اس کے قانون اور نظام کا واحد ماخذ۔ دوسری بات جو اس پہلی بات سے آپ سے آپ نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ اب رہتی دنیا تک کے لیے یہی الکتاب ہے۔ اس لیے کہ اس کو لانے والا خاتم

الانبیاء ہے (صلی اللہ علیہ وسلم) اور جس امت پر یہ اتاری گئی وہ خاتم الامم ہے، چنانچہ لامحالہ اس کو بھی خاتم الکتب ہونا چاہیے۔

دوسری جگہ جہاں الکتب (کتابوں) کا ذکر کرتا ہے وہاں ایک اشارہ پچھلی کتابوں کی طرف ہے۔ قرآن ان سب کی تصدیق کرتا ہے کہ ان کا سارا پیغام درست تھا۔ اس لیے کہ ہم ہی نے ان کو بھی اتارا تھا، ہم اس پچھلی بات کی آج تصدیق کرتے ہیں کہ وہ صحیح بات تھی اور آج بھی وہی بات کہتے ہیں جو پہلے کہی تھی۔ گویا مصحف خود یہ کہہ رہا ہے۔ اس آیت مبارکہ میں اگلی صفت یہ بتائی کہ قرآن ان کتابوں کی تصدیق کے ساتھ ساتھ مھیمنا علیہ بھی ہے یعنی اس سابقہ کتاب (یا کتابوں) پر اس طرح حاوی ہے کہ اس کے جو بنیادی عناصر ہیں ان سب کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے اور گویا اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے۔

عربی زبان میں بڑے جامع قسم کے الفاظ پائے جاتے ہیں جو مفہوم کو اس طرح ادا کرتے ہیں کہ کسی اور زبان میں وہ مفہوم اس جامعیت کے ساتھ ادا نہیں ہوگا۔ "مھیمن" کہتے ہیں اس طرح حاوی ہو جانے کو جس طرح وہ مرغی کہ جب کوئی چیل یا کوا اس کے بچوں پر جھپٹنے لگے تو وہ پر پھیلا کر اپنے سارے بچوں کو اپنے اندر لے کر سمیٹ کر ایسے بیٹھ جاتی ہے کہ کوئی بچہ اس کا باہر نہیں رہتا اور یوں وہ اپنے سب چوزوں کو اپنی حفاظت میں لے لیتی ہے۔ اس کیفیت کو مھیمن کے لفظ سے ادا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفت بھی قرآن میں مھیمن آئی ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ پوری کائنات کو اس طرح اپنے قبضے اور حفاظت میں لیے ہوئے ہیں کہ کوئی قوت ایسی نہیں ہے کہ اس کی کائنات میں دخل اندازی کر سکے، یا خالق کائنات کے کام میں مداخلت کر سکے۔ قرآن پاک کے لیے بھی یہی لفظ استعمال ہوا ہے جس کا صاف مفہوم یہ ہے کہ قرآن پاک پچھلی آسمانی

کتابوں میں دی گئی تعلیمات کا اس طرح محافظ ہے، اور ان کے عطر اور جوہر کو اس نے اس طرح قبضے میں لیا ہوا ہے کہ کوئی اس میں دخل اندازی کرکے اس کو مٹا نہیں سکتا۔

لوگوں نے تورات کو مٹا دیا، انجیل کو مٹا دیا، دیگر کتابوں میں ملاوٹیں کر دیں لیکن تورات میں کیا تھا آج ہمیں معلوم ہے یا اس لیے کہ حضرت موسیٰ نے جو کچھ کہا وہ قرآن میں لکھا ہوا ہے۔ زبور میں جو پیغام دیا گیا تھا وہ قرآن میں لکھا ہوا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی تعلیم کیا تھی اور چونکہ قرآن میں لکھا ہوا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی کیا تعلیم کیا تھی اور قرآن مجید محفوظ ہے لہٰذا ان ساری کتابوں کی بنیادی تعلیم بھی محفوظ ہے۔ یوں ہر نبی نے جو تعلیم دی وہ قرآن میں محفوظ کر دی گئی۔

قرآن میں جو بار بار کہا گیا کہ فلاں نبی کا ذکر کرو، فلاں نبی کا ذکر کرو یہ اس لیے نہیں ہے کہ بلاوجہ قصے سنانے مقصود ہیں بلکہ یہ بات ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ ہر علاقے میں، ہر زمانے میں، ہر نبی نے یہی بنیادی تعلیم دی ہے کہ اللہ ایک ہے اور وہی عبادت کے لائق ہے۔ اسی طرح آخرت، رسالت اور مکارم اخلاق کے متعلق ایک جیسی تعلیم دی گئی۔ اسی لیے الکتاب کا لفظ قرآن پاک کے لیے بھی استعمال ہوا اور پچھلی تمام آسمانی کتابوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ کتاب وہ واحد کتاب ہے جو پچھلی تمام آسمانی کتابوں کے خلاصے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب اس کتاب کے بعد کسی کتاب کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اس لیے کہ پرانی سب کتابیں مٹ کر ختم ہو گئیں، اب ان پرانی کتابوں کی ہمیں کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جو کچھ ہے وہ اب اس کتاب میں موجود ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اب یہی واحد کتاب ہے جو ان ساری کتابوں کے قائم مقام کی حیثیت رکھتی ہے۔ اب ان کتابوں کے صرف نام اور حقیقت پر ہم ایمان رکھتے ہیں کہ جب وہ اتاری گئی تھیں تو وہ صحیح تھیں، اور جس

زمانے کے لیے وہ اتاری گئی تھیں اس وقت تک کے لیے صحیح تھیں۔ ان سب کی تعلیم تصدیق اور خلاصے کے طور پر اب الکتاب یعنی قرآن مجید میں موجود ہے۔ یہ ہے مفہوم الکتاب کا جو قرآن پاک کے نام کے طور پر کئی مقامات پر آیا ہے۔

۳۔ الفرقان

اس کتاب کا تیسرا اہم اور معنی خیز نام الفرقان ہے۔ سورۃ فرقان کا آغاز ہی اس اعلان سے ہوتا ہے:

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ (۱)

وہ ذات انتہائی بابرکت ہے جس نے اپنے بندے پر الفرقان نازل فرمائی۔

عربی زبان میں فرقان مصدر کا وزن ہے اور عربیت کے قاعدے سے اگر مصدر کے وزن کو کسی صفت کے مفہوم میں استعمال کیا جائے تو اس میں دوام اور تسلسل کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ لغوی اعتبار سے فرق اور فاروق سے مراد وہ چیز یا وہ فرد ہے جو کوئی سی دو چیزوں کے درمیان فرق کرتا ہو۔ فروق میں مبالغے کا مفہوم بھی موجود ہے اور اصطلاحاً فاروق سے مراد وہ ہستی یا شخصیت ہے جو حق اور باطل میں فرق کر دے، جو جھوٹے اور سچے کو الگ الگ کر دے، جو کھرے اور کھوٹے کو جدا جدا کر دے۔ فرقان کا بھی یہی مفہوم ہے لیکن اس میں مبالغے کے ساتھ ساتھ دوام اور تسلسل کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ لہٰذا فرقان کے معنی ہیں وہ چیز جو حق و باطل میں دائمی طور پر تمیز کر سکے اور کھرے کھوٹے کو الگ الگ کر کے یہ بتا سکے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ گویا فرقان سے مراد وہ دائمی کسوٹی ہے جو پرکھ کر یہ بتا سکے کہ سونا کھرا ہے کہ کھوٹا۔

قرآن مجید نہ صرف فرقان ہے بلکہ الفرقان ہے یعنی وہ واحد اور مخصوص

کسوٹی جو اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ الفرقان کے آجانے کے بعد اب کسی فارق یعنی حق اور فرقان کی ضرورت نہیں رہی۔ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حق و باطل کی واحد کسوٹی یہی الفرقان ہے۔ اب یہی الفرقان وہ المیزان ہے جس پر تول کر دیکھا جائے گا کہ کون اس پر پورا اترتا ہے اور کون ہلکا ثابت ہوتا ہے۔ اب جو کچھ اس دائمی کسوٹی کی پرکھ پر پورا اترتا ہے وہ صحیح درست اور قابل قبول ہے اور جو پورا نہیں اترتا وہ غلط اور ناقابل قبول ہے۔ یہ ایک فولادی چوکھٹا ہے جس سے کسی بھی چیز کا صحیح اور مکمل ہونا جانچا جائے گا، جو جتنا پورا ہے اتنا مکمل ہے اور جو جتنا چھوٹا ہے اتنا کھوٹا ہے۔ یہ سارے مفاہیم الفرقان کے لفظ میں شامل ہیں۔

۴۔ الذکر

اس کتاب کا چوتھا نام الذکر ہے۔ ذکر کے معنی یاددہانی کے ہیں۔ قرآن پاک میں کئی آیات میں قرآن مجید کو الذکر کے لفظ سے یاد کیا گیا ہے۔ سورۃ الحجر میں جہاں قرآن پاک کی حفاظت کا ذکر ہے وہاں الذکر ہی کا نام استعمال فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ (۱۰)

ہم نے ہی اس ذکر (یعنی قرآن حکیم) کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

ذکر یعنی یاددہانی کا لفظ اپنے اندر بڑی معنویت رکھتا ہے۔ اگر آپ پہلی مرتبہ کسی کو کوئی خط لکھیں یا پہلی مرتبہ کسی سے کوئی سوال، مطالبہ یا درخواست کریں تو آپ اس کو یاددہانی کے لفظ سے تعبیر نہیں کرتے۔ یاددہانی اس صورت میں ہوتی ہے جب آپ وہ بات پہلے کہہ چکے ہوں۔ کوئی بات، تحریر یا خط اگر ایک بار بھیجا جا چکا ہو اور اس

پر عمل نہ ہوا ہو، یا اس کو غلط سمجھ گیا ہو یا اس میں کسی نے رد و بدل کر دی ہو یا وہ سابقہ تحریر سرے سے گم ہوگئی ہو تو پھر یاد دہانی کی ضرورت پیش آتی ہے۔

قرآن مجید اس اعتبار سے ایک یاد دہانی کی حیثیت رکھتا ہے کہ وہ پچھلی تمام کتابوں کی آخری، حتمی، قطعی اور مکمل یاد دہانی ہے۔ قرآن مجید چوں کہ دوسری تمام آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور قرآنی وحی کو سابقہ کتابوں کی وحی کا ہی تسلسل قرار دیتا ہے اس لیے اس کی نوعیت دین کی بنیادی تعلیمات کے لیے ایک یاد دہانی ہی کی ہونی چاہیے۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ قرآن مجید پچھلی تمام آسمانی کتابوں کے بنیادی اور اساسی پیغام پر حاوی ہے۔ قرآن کا یہ حاوی ہونا خود ایک مسلسل یاد دہانی کی حیثیت رکھتا ہے۔

ذکر کے معنی یاد دہانی کے علاوہ کسی چیز کو زبانی یاد کرنے کے بھی آتے ہیں۔ قرآن مجید اس اعتبار سے بھی الذکر ہے کہ دیگر آسمانی کتابوں کے برعکس یہ واحد کتاب ہے جس کو حفاظت کی خاطر کروڑوں انسانوں نے کاغذی صحیفوں کے ساتھ ساتھ سینوں میں بھی محفوظ رکھا۔ قرآن مجید کے علاوہ دنیا کی تاریخ میں کوئی اور ایسی کتاب نہیں ہے جس کو اس محبت، عقیدت، احترام، اہتمام اور انہماک سے لاکھوں اور کروڑوں انسانوں نے اپنے سینوں میں محفوظ کیا ہو۔ اس مفہوم کے اعتبار سے بھی اگر کسی کتاب پر الذکر کا لقب صادق آسکتا ہے تو وہ یہی کتاب حکیم ہے۔

یہ چار تو وہ نام ہیں جو قرآن میں جا بجا آئے ہیں اور اس کتاب کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے صفاتی نام بھی ہیں جو وقتاً فوقتاً قرآن پاک میں استعمال ہوئے ہیں اور اس کتاب کی مختلف حیثیتوں کو اور مختلف صفتوں کو اجاگر کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر کتاب اللہ کے لیے عظیم کا لفظ آیا ہے، مجید، حکیم اور دوسری بہت سی صفات آئی ہیں جن کا اندازہ سیکڑوں میں ہے۔ یہ ساری قرآن کی

صفتیں ہیں یعنی یہ وہ کتاب ہے جو سراپا حکمت و دانائی ہے، جو عظیم الشان ہے، جو بزرگی اور برتری والا ہے۔ اس طرح دیگر صفات قرآن مجید کی مختلف حیثیتوں اور اوصاف کو بیان کرتی ہیں۔

قرآن پاک کا موضوع

دنیا کی ہر کتاب کا کوئی نہ کوئی موضوع ضرور ہوتا ہے۔ کوئی کتاب معاشیات کی کتاب کہلاتی ہے، کوئی سائنس کی، کوئی تاریخ یا جغرافیے کی۔ اس عام بات سے قرآن مجید جیسی اہم ترین کتاب کیوں کر مستثنیٰ ہوسکتی ہے۔ لہٰذا یہ جا طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن پاک کا موضوع کیا ہے؟ یہ کس موضوع کی کتاب ہے؟ کیا آپ قرآن کو فلسفے کی کتاب قرار دیتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں۔ اگرچہ اس کتاب میں فلسفے کے بہت سے مسائل زیر بحث آئے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ فلسفے کی کتاب نہیں ہے۔ کیا پھر قرآن پاک معاشیات کی کتاب ہے؟ اس میں بہت سے بنیادی معاشی مسائل کا حل بتایا گیا ہے، دولت کی تقسیم کیوں کر ہو، دولت کمائی کیسے جائے۔ تقسیم دولت کے بارے میں ریاست کی ذمے داریاں کیا ہیں؟ ان مباحث کے باوجود ماہرین معاشیات کی نظر میں قرآن پاک بہ ہر حال معاشیات کی کتاب نہیں ہے۔ کم از کم اس انداز کی معاشیات کی کتاب نہیں ہے جس انداز کی معاشیات کی کتابیں عام طور پر ہوتی ہیں۔ اسی طرح یہ قانون کی کتاب بھی نہیں ہے، نہ قانون کا کوئی طالب علم فنی مفہوم میں اس کو قانون کی کتاب قرار دیتا ہے۔ اس لیے کہ اس میں نہ قانونی اصطلاحات ہیں اور نہ قانون وفقہ کی

فنی زبان اس میں استعمال کی گئی ہے۔ اگرچہ اس میں قانون کے بہت سے پیچیدہ مسائل حل کیے گئے ہیں۔

درحقیقت غور کیا جائے تو واضح طور پر نظر آتا ہے کہ قرآن پاک ان علوم و فنون میں سے فنی طور پر کسی علم کی کتاب نہیں ہے۔ اس کو نہ ہم قانون کی کتاب کہہ سکتے ہیں، نہ معاشیات کی، نہ فلسفے کی، نہ تاریخ کی اور نہ نفسیات کی۔ اگرچہ ان تمام علوم کے بنیادی مسائل کا جواب اس کتاب میں موجود ہے۔ ہاں اس کو ہم کتاب ہدایت کہہ سکتے ہیں جو ان موضوعات پر پائی جانے والی ساری کتابوں کے لیے رہنما اور کسوٹی کی حیثیت رکھتی ہے۔ مندرجہ بالا اور دیگر بہت سے موضوعات پر لکھی جانے والی ہر وہ کتاب جو اس کتاب ہدایت کے مطابق ہے وہ سچی کتاب ہے اور ہر وہ کتاب جو قرآن پاک سے متعارض ہے وہ جھوٹی کتاب ہے۔

لیکن یہ سوال پھر بھی برقرار رہتا ہے کہ اس کتاب ہدایت کا اپنا موضوع کیا ہے۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے جب ہم قرآن مجید پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن پاک کا اپنا موضوع ہے "اس دنیاوی زندگی میں انسان کا کردار اور انسان کی آخری اور اخروی منزل مقصود" یہ چیز قرآن پاک کا بنیادی مضمون ہے۔ یعنی اس بات کی وضاحت و تشریح کہ اس زندگی میں انسان کی ذمے داری اور بالآخر اس کی وہ منزل مقصود جہاں اس کو جانا ہے وہ کیا ہے؟ اور وہاں کیسے پہنچا جائے؟ قرآن پاک شروع سے لے کر آخر تک بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی ایک موضوع سے بحث کرتا ہے کہ انسان کیا ہے؟ کہاں سے، کیوں اور کیسے آیا ہے؟ اور بالآخر اسے کہاں جانا ہے؟ اس کی ذمے داریاں کیا ہیں؟ اسے کیا کرنا چاہیے۔

اس ایک سوال کا جو بہت سے سوالوں کا مجموعہ ہے، جواب دینے کے لیے

قرآن پاک زندگی کے تمام مسائل سے بحث کرتا ہے۔ اس بنیادی سوال کا جواب دینے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ انسان کی عائلی زندگی، خاندانی زندگی، اس کی معاشرتی زندگی، اس کی معاشی زندگی، اس کے معاملات، اس کے کاروبار، اس کی سیاسی زندگی غرض انسان کی زندگی کے ہر پہلو سے بحث کی جائے، اور یہ بتایا جائے کہ وہ انسان، معیشت، معاشرے اور حکومت کا کاروبار کس طرح چلائے؟ ان پہلوؤں میں پیش آنے والے تمام سوالات سے بحث کی جائے۔ جنگ کے حالات ہوں تو اس کا رویہ کیسا ہو، امن کے دوران اس کا رویہ کیا ہو، غرض انسانی زندگی کے ہر پہلو پر غور کرنے کی ضرورت اس میں پیش آئے گی۔ اس لیے قرآن پاک میں ان سارے مسائل سے جن کی ضرورت اس بنیادی سوال کا جواب دینے کے لیے پڑتی ہے، بحث کی گئی ہے۔

لہٰذا قرآن مجید میں انسانی زندگی سے بحث کرنے والے تمام علوم وفنون کی بنیادیں موجود ہیں۔ اس کتاب کا اصل ہدف یہ ہے کہ انسان کس طرح کامیاب طریقے سے منزل مقصود پر پہنچ جائے، اس لیے اس اصل ہدف کے تقاضوں اور ضروریات کے مطابق اس کتاب میں سائنس کی معلومات بھی آتی ہیں، معاشیات اور دوسرے بہت سے علوم کی تعلیم سے متعلق سوالات جن کی راستے میں ضرورت پیش آئے گی ان سب کا جواب دیا گیا ہے۔ لیکن اس کتاب کے اسلوب میں اور دوسرے تمام علوم وفنون کے انداز میں ایک نمایاں فرق ہے۔ مثلاً آپ کہہ سکتے ہیں کہ سائنس بھی ان سوالوں کا جواب دے سکتی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ فلسفہ بھی ان سوالوں کا جواب دے سکتا ہے کہ انسان کہاں سے آیا؟ کیوں آیا؟ اور اس کو بالآخر کہاں جانا ہے؟ اور قرآن پاک بھی ان سوالوں کا جواب دیتا ہے۔ ذرا غور سے دیکھیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن پاک

کے جواب میں اور باقی تمام فلسفوں اور نظاموں کی طرف سے دیے جانے والے جوابوں میں ایک بڑا بنیادی فرق ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ دوسرے نظاموں اور فلسفوں میں توجہ کا مرکز انسان کا ماضی یعنی اس کا آغاز ہے۔ وہاں بیشتر بحث اس بات پر ہوتی ہے کہ انسان کہاں سے آیا اور کیسے آیا؟ یہ زیادہ سے زیادہ یہ بحث ملتی ہے کہ اب یہاں اس کو کیا کرنا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ انسان کے بارے میں سائنس کی ۹۰ فیصد بحثیں یہی ہیں کہ انسان کہاں سے آیا ہے؟ کوئی بندر پر تحقیق کر رہا ہے، کوئی بن مانس پر تحقیق کر رہا ہے، غرض آغاز کے متعلق لوگ ہزاروں سال سے بحثوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ اس سے سائنس کو بہت کم بحث ہوتی ہے کہ یہاں انسان کو کیا کرنا چاہئے؟ اور اس سے تو شاذ و نادر ہی کسی کو بحث ہوتی ہے کہ انسان کو بالآخر کہاں جانا ہے؟ اور جہاں جانا ہے وہاں کامیابی کیسے حاصل کی جائے؟ اس اصل سوال سے ان میں سے کسی کو بحث نہیں ہوتی۔ نہ سائنس کو، نہ سماجیات کو اور نہ بشریات کو۔ آپ غور کریں کہ آخر یہ چیز ہمارے لیے کیا عملی افادیت رکھتی ہے کہ انسان کہاں سے اور کیسے آیا؟ قرآن نے بھی اس سوال کا جواب دیا ہے۔ لیکن اس کو بنیادی مسئلہ نہیں بنایا۔ ایک واضح اور سادہ جواب دینے پر اکتفا کیا ہے اور تفصیلات کو غیر ضروری قرار دے کر چھوڑ دیا ہے لیکن زیادہ توجہ اس پر دی ہے کہ اب انسان کو یہاں کیا کرنا چاہئے، اسے اب آگے کہاں جانا ہے اور اپنے سفر کو کیسے مکمل کرنا ہے۔

یہ ایک واضح بات ہے کہ ہم میں سے کسی کا آغاز بھی ہمارے اپنے قبضے میں نہیں ہے۔ جب ہم اس دنیا میں آتے ہیں تو اپنی مرضی سے نہیں آتے۔ ہم میں سے کوئی بھی اپنے آزادانہ فیصلے، مرضی اور اختیار سے اس دنیا میں نہیں آیا۔ کسی نے مجھ سے نہیں پوچھا تھا کہ میاں! تمہیں اس دنیا میں بھیجوں یا نہ بھیجوں۔ نہ اللہ تعالیٰ نے پوچھا، نہ

میرے ماں باپ نے پوچھا۔ مجھے تو اس دنیا میں آنے کا شعور بھی پیدائش کے کئی سال بعد ہوا۔ اب بھی اگر کوئی انسان چاہے کہ وہ اس دنیا میں آنے یا نہ آنے کا خود فیصلہ کرلے تو یہ بھی اس کے اختیار میں نہیں ہے۔ لہٰذا جو چیز ہمارے اختیار میں نہیں ہے ہم اس کے آغاز کے متعلق بہت سی تفصیلات جان کر بھی کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ آئندہ بھی لوگ اس دنیا میں آتے رہیں گے اور وہ بھی اسی بے اختیاری سے ہی آئیں گے۔ اس لیے انسان کے آغاز پر بہت زیادہ غور وفکر کرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ توجہ وہاں دینی چاہیے جو ہمارے اختیار میں ہو۔ آئندہ کامیابی کی منزل کا حصول میرے اختیار میں بھی ہے اور آپ کے اختیار میں بھی ہے۔ اگر میں کامیابی سے اپنی منزل پر پہنچنا چاہوں تو اللہ نے مجھے اس کے لیے وسائل دیے ہیں اور میں ایسا کرسکتا ہوں۔ مجھے اختیار بھی دیا ہے، اسباب بھی پیدا کیے ہیں اور حالات بھی فراہم کیے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک نے اس چیز پر زور دیا جو ہمارے اختیار میں ہے، ہم اس کو بنا بھی سکتے ہیں اور برباد بھی کر سکتے ہیں۔ سنوار بھی سکتے ہیں اور بگاڑ بھی سکتے ہیں۔ یہ ہے فرق قرآن پاک اور باقی کتابوں میں۔ قرآن پاک مستقبل کی بات کرتا ہے۔ جسے انگریزی میں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن پاک کا اسلوب Future-Oriented ہے یعنی نظریہ مستقبل۔ باقی علوم وفنون کا اسلوب Past-Oriented ہے یعنی نظریہ ماضی۔ صرف ماضی میں جھانکتے رہنے سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ اگر مستقبل سے نظر ہٹ جائے جو آپ کے بس میں ہے اور اس کا بنانا اور بگاڑنا دونوں آپ کے اختیار میں ہیں، تو زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ اس مضمون کو اقبال نے بہت عمدہ اسلوب اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے:

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے

کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے

تو گویا ابتدا کی ایک حد سے زیادہ فکر کرنا غیر ضروری ہے۔ فکر انجام کی کرنی

چاہیئے۔ قرآن پاک میں بھی آپ کو جا بجا ملے گا۔

اَلْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ○

انجام تو پرہیزگاروں کا ہی ہے۔

جس کا حرف حرف یہی سبق دیتا ہے کہ اصل مقصود مسلمان کی آخرت کی زندگی ہے

اسی کو منزل مقصود سمجھنا چاہیئے۔

موضوعات قرآنی

چناں چہ قرآن نے اس حقیقت کو ذہن نشین کرانے کے لیے جو مباحث اختیار کیے ہیں ان کو ہم پانچ بنیادی موضوعات یا عنوانات میں تقسیم کرسکتے ہیں۔ یہ عنوانات قرآن پاک میں ہر جگہ بکھرے ہوئے ہیں اور حسب ضرورت و موقع اجمال اور تفصیل دونوں کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ قرآن پاک کی ہر منزل میں، ہر سورت میں حتیٰ کہ بیشتر آیات میں یہ پانچ موضوعات براہ راست یا بالواسطہ نظر آئیں گے۔ یہ موضوعات اس ایک سوال کے پانچ مختلف پہلوؤں سے بحث کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ چھوٹے چھوٹے مباحث بھی ہیں جو ان ہی پانچ مباحث کے نتیجے کے طور پر قرآن پاک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ وہ پانچ بنیادی مباحث یہ ہیں:

۱۔ عقائد

۲۔ احکام

۳۔ اخلاق

۴۔ ایام اللہ

۵۔ حیات بعد الممات یعنی موت کے بعد زندگی

۱۔ عقائد

سب سے پہلا بنیادی بحث جو قرآن پاک میں سورۃ الفاتحہ سے الناس تک ملتا ہے وہ عقائد کا مضمون ہے۔ یہ مضمون قرآن پاک میں ہر جگہ موجود ہے، کہیں کھلا ہوا بیان ہوا ہے اور کہیں چھپا ہوا دوسرے مضامین کے سیاق میں ملتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی حیثیت کیا ہے؟ اس کائنات کو کس نے بنایا ہے۔ یہاں انسان کو کیا کرنا ہے؟ کیوں کرنا ہے؟ یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جن کا جواب زندگی کے کسی بھی نظام کی تشکیل کے لیے ضروری ہے۔ ان ہی سوالات کے جواب سے اسلام کے تصور کائنات کی بنیادیں سامنے آتی ہیں۔ یہ وہ چیز ہے جسے عقائد کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قرآن پاک نے عقائد کے ضمن میں ان تمام بنیادی سوالات کا جواب دے دیا ہے جن کی ضرورت روزمرہ زندگی کے مسائل کے حل میں پڑتی ہے۔ عقیدے سے متعلق کوئی بنیادی سوال ایسا نہیں رہتا جس کا جواب قرآن پاک میں نہ دے دیا گیا ہو۔ بے شمار غلط فہمیاں جو عقائد کے بارے میں انسان کے دماغ میں آسکتی ہیں ان کا جواب بھی دیا ہے۔ مختلف اسلام دشمن عناصر، مشرکین و کفار، جو اعتراضات کرتے رہے ہیں، آج کرتے ہیں یا آئندہ کرتے رہیں گے ان کا جواب بھی ان مباحث میں موجود ہے۔

لیکن عقائد سے متعلق جو مواد قرآن پاک میں بیان ہوا ہے، اول سے لے کر آخر تک اگر آپ اس کا جائزہ لیں تو آپ دیکھیں گے کہ یہ سب تین بنیادی مسائل کے جوابات ہیں جو عقیدے کے باب میں بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

سب سے بڑا بنیادی مسئلہ توحید ہے کہ اللہ ایک ہے، وہی اس کائنات کا پیدا کرنے والا ہے، اور تمام صفات کمال سے متصف ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ ہر سلیم الطبع انسان ذرا سا غور کرے تو وہ جلد ہی توحید پر ایمان لے آتا ہے۔ جب بھی کوئی صاحب عقل اور صاحب علم انسان تھوڑا سا غور کر کے یہ دیکھتا ہے کہ یہاں دنیا میں کیا نظام چل رہا ہے؟ کیسے یہ کائنات کام کر رہی ہے؟ تو وہ خود بخود اللہ رب العزت کی ذات تک پہنچ جاتا ہے اور اس کو یہ تسلیم کر لینے اور اس بات کا اعتراف کر لینے میں کوئی تامل نہیں ہوتا کہ اس کائنات کا ایک بنانے والا ہے۔ اس کو یہ مان لینے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی کہ اس کائنات کا نظام کسی خود کار طریقے سے نہیں چل رہا بلکہ کسی چلانے والے کے حکم اور مشیت کے تحت ہی چل رہا ہے۔ جب وہ یہ سب کچھ مان لیتا ہے تو پھر اس کو جلد ہی یہ احساس بھی ہو جاتا ہے کہ عقیدہ توحید کے منطقی نتیجے کے طور پر اسے آخرت پر ایمان لانا چاہیے۔ اس لیے کہ جب ایک بار اللہ کے بارے میں یہ مان لیا کہ وہ قادر مطلق ہے تو یہ بھی ماننا چاہیے کہ وہ سمیع و بصیر ہے۔ پھر اس کو دانا بھی ہونا چاہیے، حکیم بھی ہونا چاہیے، پھر اس کے دیے ہوئے نظام میں توازن اور اعتدال بھی ہونا چاہیے۔ خود سائنس دان کائنات میں موجود اس عظیم الشان اور بے مثال توازن کو تسلیم کر چکے ہیں۔ انہوں نے اس توازن کی بڑی بڑی ایمان افروز مثالیں دریافت کی ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ اگر زمین اور سورج کا فاصلہ چند فٹ بھی کم و بیش ہو جائے تو ساری کائنات درہم برہم ہو سکتی ہے۔ لہذا کوئی ایسی قوت ضرور ہے جو توازن اور اعتدال سے اس نظام کو چلا رہی ہے جس نے اس کائنات کو کنٹرول کیا ہوا ہے۔ لہذا اگر انسان اس کائنات کے نظام پر غور کرے تو خود بخود اللہ کی ان تمام صفات تک پہنچ جائے گا جو قرآن میں بیان ہوئی ہیں۔

جب وہ یہ سب مان لے تو پھر اس کو یہ بھی ماننا چاہیے کہ جس خالق نے یہ کائنات پیدا کی ہے اس نے بغیر کسی مقصد کے اس کو پیدا نہیں کیا، اس کے پیچھے مقصد

ہو تا چاہئے۔ مجھے اپنے بچپن کا واقعہ اچھی طرح یاد ہے۔ جب میں نے پہلی مرتبہ قرآن کی یہ آیت اور اس کا ترجمہ پڑھا کہ

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (۱)

ہم نے زمین اور آسمان کو کھیل کے لیے پیدا نہیں کیا۔

تو میرے دل میں یہ خیال آیا کہ کون کہتا ہے کہ آپ نے کھیل کود کے لیے پیدا کیا ہے؟ میرے ذہن میں مدتوں یہ سوال آتا رہا کہ اتنی واضح بات کو کہنے کی کیا ضرورت تھی اور سوچتا رہا کہ ایسا کیوں فرمایا گیا۔ بعد میں جب میں نے مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا تو میں نے ہندوازم میں پڑھا کہ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا نے یہ کائنات کھیل اور تفریح کی غرض سے پیدا کی ہے۔ یہ سارا سنسار رام کی لیلا ہے۔ لیلا کے معنی کھیل کے ہیں اور یہ پوری کائنات رام کا کھیل ہے، اس کے بنانے کی کیفیت وہی ہے جو بچوں کی طرف سے ریت کا گھروندہ بنانے کی ہوتی ہے۔ وہ محض تفنن طبع کے لیے ریت کے گھروندے بناتے ہیں اور جب دل بھر جاتا ہے تو اسے توڑ کر چلے جاتے ہیں، پھر کسی اور کھیل میں لگ جاتے ہیں۔ اسی طرح ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ رام تفریح طبع کی خاطر طرح طرح کی دنیا ئیں بناتا ہے اور جب دل بھر جاتا ہے تو ان کو تباہ کر کے پھر نئی دنیا بنانے کی طرف چل پڑتا ہے۔ اس نے موجودہ دنیا بھی کھیل اور تفریح کے لیے بنائی ہے۔ جس دن اس سے اس کا دل بھر جائے گا وہ اس کو تباہ کر دے گا۔ پھر کچھ اور بنائے گا۔ جب میں نے ہندومت میں یہ بات پڑھی اس وقت مجھے پتہ چلا کہ قرآن کی اس آیت میں یہ بات کیوں بیان کی گئی، اس سے قرآن پاک پر میرا ایمان و ایقان غیر معمولی طور پر بڑھا، کیوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم جہاں تشریف فرما تھے وہاں کسی کو یہ علم نہیں تھا کہ ہندو نام کی کوئی قوم بھی دنیا میں پائی جاتی ہے یا ہندو قوم کے عقائد کیا

ہیں اور وہ کہاں آباد ہے۔ گویا مسلمانوں کو ایک آئندہ آنے والے مسئلے کے متعلق پہلے سے بتا دیا گیا کہ یہ کائنات کسی کھیل یا تفریح کے نتیجے میں نہیں بنائی گئی، بلکہ اس کو بالحق، یعنی ایک واضح اور دوٹوک مقصد کے ساتھ بنائی گئی ہے۔

اسی طرح قرآن میں فرمایا گیا:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ۖ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ (۱۲)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کو چھ دن میں پیدا کیا اور ہمیں تکان نے چھوا تک نہیں۔

ایک جگہ آتا ہے ہم پر کوئی تھکاوٹ یا تعب طاری نہیں ہوئی۔ فرمایا:

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى (۱۳)

کیا انہوں نے نہیں دیکھا کہ جس اللہ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کر دیا اور وہ ان کی تخلیق میں ذرا نہیں تھکا، وہ یقیناً مُردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے۔

مجھے پھر خیال آیا کہ کون یہ سوچتا ہوگا۔ خدا تو قادر مطلق ہے، اس پر تھکن کے آثار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن جب میں نے بائبل پڑھی تو دیکھا اس کے شروع ہی میں یہ بات موجود ہے کہ خدا نے چھ دن میں زمین اور آسمان کو پیدا کیا اور ساتویں دن تھک کر آرام کیا۔ اسی کو یہودی یوم السبت کہتے ہیں۔ اس دن چھٹی کرتے ہیں اور آرام کرتے ہیں۔ یہ پڑھ کر مجھے معلوم ہوا کہ قرآن میں یہ آیت کس غلطی کے ازالے کے لیے نازل کی گئی۔

یاد رہے کہ موجودہ بائبل کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے کا نام ہے عہد نامہ قدیم، اور دوسرے حصے کا نام ہے عہد نامہ جدید۔ عہد نامہ قدیم کو صرف یہودی مانتے ہیں۔ عیسائی دونوں کو مانتے ہیں۔ پہلے حصے میں ۳۹ صحیفے یا کتابیں شامل ہیں۔ ان میں سے پہلی پانچ کتابوں کو عربی میں خاسس خمس کہتے ہیں اور انگریزی میں Pentateuch کہتے ہیں۔ ان پہلی پانچ کتابوں کے متعلق یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ یہی وہ توراۃ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اتاری گئی تھی۔ مدعا یہ ہے کہ اس طرح کے غلط عقائد کی قرآن میں جابجا تردید کی گئی ہے اور ان کی جڑ کاٹ دی گئی ہے۔

دوسری اہم حقیقت جو قرآن پاک نے جابجا بیان کی ہے وہ یہ ہے کہ بعض اوقات انسان جب صحیح رستے سے بھٹکتا ہے تو اس کے دو سبب ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ ہوتا ہے کہ انسان کو صحیح عقیدہ معلوم نہیں ہوتا۔ دوسرا سبب یہ ہوتا ہے کہ صحیح عقیدہ معلوم تو ہوتا ہے لیکن وہ اپنے بارے میں یا تو احساس برتری کا شکار ہو جاتا ہے یا احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ انسان کا یہ مزاج ہے کہ وہ پوری کائنات کو اپنے ہی حوالے سے دیکھتا ہے۔ یہ انسان کی فطری کمزوری ہے۔ اگر کوئی شخص مجھ سے لڑتا ہے تو میں کہوں گا کہ وہ برا ہے، اور اگر مجھ سے اچھا برتاؤ کرتا ہے تو میں کہوں گا کہ وہ اچھا ہے۔ جب انسان اپنے بارے میں احساس برتری کا شکار ہوتا ہے تو اپنے کو بڑھاتے بڑھاتے خدا مان لیتا ہے اور خود کو دوسرے انسانوں کا مالک و مختار سمجھنے لگتا ہے۔ جب وہ احساس کمتری کا شکار ہوتا ہے تو اس سے گمراہی کی دوسری بہت سی شکلیں پیدا ہوتی ہیں۔ جب انسان اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھتا ہے تو پھر وہ گائے، بندر اور سانپوں تک کو دیوتا مان لیتا ہے۔ قرآن نے اس افراط و تفریط کی اصلاح کی۔ قرآن نے بتایا کہ انسان کا صحیح مقام عبد یعنی بندے کا ہے۔ اگر انسان بندے سے بڑا مقام چاہتا ہے تو وہ

عبدیت کا ہی مقام ہے۔ اس مقام سے بڑا مقام اللہ نے کسی کے لیے نہیں رکھا۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۴)

ہم نے آدمؑ کو دیگر تمام مخلوقات پر فضیلت دی ہے۔

خلیفہ کے لفظ کے متعلق ایک غلط فہمی بھی دور کرنا ضروری ہے۔ خلافت اور جانشینی کے لفظ سے ایک الجھن پیدا ہوتی ہے۔ عام طور سے جب ایک صدر مر جاتا ہے تو دوسرا اس کے جانشین کے طور پر آ جاتا ہے۔ کوئی پیر دنیا سے رخصت ہو جائے تو دوسرا بزرگ بطور جانشین آ جاتا ہے۔ لیکن اللہ تو حی و قیوم ہے، اس کا جانشین کیسے ہو سکتا ہے۔ اس غلط فہمی یا اشکال کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ جانشینی کا مفہوم سمجھ لیا جائے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ جانشینی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک جانشینی ہوتی ہے اس کے غائب ہونے کی صورت میں جس نے جانشین بنایا ہے۔ ایک جانشینی ہوتی ہے لتشریفاللمستخلف کہ جس کو خلیفہ یا جانشین بنایا ہے اس کی عزت افزائی مقصود ہوتی ہے، اس کا احترام کرنا مقصود ہوتا ہے، مثلاً کسی مسجد میں ایک امام صاحب ایک مہمان بزرگ کی عزت افزائی کے لیے ان سے کہتے ہیں کہ آپ نماز پڑھا دیں، یا مثلاً آپ کسی تقریب یا جلسے کی صدارت کر رہے تھے، آپ نے دیکھا کہ حاضرین میں کوئی صاحب بڑے معزز بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ نے ان کو کرسی صدارت پیش کر دی۔ تو اس طرح کی جانشینی دینا گویا عزت کے لیے ہوتا ہے۔ جہاں تک تعلق "خلیفۃ فی الارض" کا ہے تو اس کا مفہوم یہ نہیں کہ کوئی بادشاہ مر گیا تو نیا بادشاہ آ گیا بلکہ اس کی حیثیت ایسی ہے گویا کسی بڑی سلطنت کے چھوٹے سے حصے پر کسی فرد کو کچھ اختیارات دے کر کچھ عرصے کے لیے متعین کیا گیا ہو۔ یعنی وہ اصل بادشاہ کا ہرکارہ ہے لیکن باقی سب کے

ہے حکم راں کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ وہ معتقدات ہیں جو قرآن پاک نے عقائد کے بارے میں جا بجا بیان کیے ہیں۔

۲۔ احکام

قرآن پاک کا دوسرا اہم مبحث احکام ہے۔ قرآن مجید جو نسخہ کیمیا لے کر آیا ہے اس کا سب سے بڑا مقصد انسان کو دنیاوی زندگی میں کام یابی کے ساتھ ساتھ آخروی زندگی میں بھی کام یاب و کام راں بنانا ہے۔ دنیاوی کام یابی کے لیے قرآن مجید میں عموماً صلاح کی، اور اخروی زندگی میں کام یابی کے لیے فلاح کی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ صلاح اور فلاح کے لیے ضروری ہے کہ انسانی زندگی کسی قاعدے اور ضابطے کے تحت منظم ہو۔ قرآن مجید نے جو تفصیلی ضابطۂ زندگی عطا فرمایا ہے وہ زندگی کے تمام پہلوؤں کو منظم کرتا ہے۔ انسان اپنی روز مرہ زندگی میں جو کچھ کرتا ہے اس کو صحیح خطوط پر منظم اور استوار کرنے کے لیے قرآن پاک میں ضروری اور بنیادی احکام دیئے گئے ہیں۔ انسان اپنی ذاتی، خاندانی، معاشرتی، اقتصادی، اجتماعی، سیاسی اور بین الاقوامی زندگی میں جو کچھ کرتا ہے اس کو مفید، نتیجہ خیز اور بہتر بنانے کے لیے قرآن پاک نے جا بجا ہدایات دی ہیں۔ قرآن پاک کی ان آیات کا جن میں اس طرح کے احکام بیان کیے گئے ہیں جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ کتاب الٰہی نے انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک، زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا جس کے بارے میں ہدایات نہ دی ہوں۔

قرآن پاک کے یہ احکام معاشرتی ہدایات اور اجتماعی راہ نمائی پر بھی مشتمل ہیں اور قانونی اصول و ضوابط پر بھی۔ ہولی الذکر پر عمل درآمد کا قوت نافذ خود انسان کا ضمیر اور قوت محرکہ اللہ کے حضور جواب دہی کا احساس ہے۔ مزید برآں معاشرتی دباؤ

بھی انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ان ہدایات پر کاربند رہے۔ مؤخر الذکر احکام کی نوعیت قانونی ضوابط کی ہے جن پر عمل درآمد جہاں فرد کی ذمہ داری ہے، وہیں کچھ حدود کے اندر ریاست کی ذمہ داری بھی ہے۔

قرآن مجید کی وہ آیات جن کو آیات احکام کہا جاتا ہے اکثر و بیشتر عمومی ہدایات پر مشتمل ہیں۔ قرآن مجید نے تفصیلات سے تعرض نہیں کیا، اس لیے کہ تفصیلات کا تعلق حالات اور زمانے کے تقاضوں سے ہوتا ہے۔ یہ امت کے اہل علم و دانش اور فقہاء اسلام کی مشترکہ ذمہ داری ہے کہ وہ اجتہاد اور اجماع کے اصولوں سے کام لے کر قرآن مجید کی عمومی ہدایات، بنیادی احکام اور اصولوں کو سامنے رکھ کر اسوہ حسنہ کی روشنی میں اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کردہ حدود کے اندر رہتے ہوئے حالات و زمانے کے مطابق تفصیلات طے کریں۔

قرآن مجید کی آیات احکام کی تعداد تعین مشکل ہے۔ قرآن مجید کی چھ ہزار سے زائد آیات میں تین سو کے لگ بھگ آیات ایسی ہیں جن کو آیات احکام کہا جاتا ہے۔ یہ تین سو آیات وہ ہیں جن میں براہ راست فقہی احکام اور قانونی اصول بیان فرمائے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور آیات سے بعض اہل علم نے بالواسطہ احکام کا استنباط کیا ہے۔ یہ آیات جن سے بالواسطہ احکام کا استنباط ہوا ہے دو سو کے قریب ہیں۔ یوں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ساری آیات احکام مجموعی طور پر پانچ سو سے زائد نہیں ہیں۔ یہ تعداد قرآن مجید کی کل آیات کے ۱۳ ویں حصے کے قریب قریب ہے۔

پھر آیات احکام میں بھی زیادہ زور جن دو پہلوؤں پر دیا گیا ہے وہ عبادات اور خاندانی زندگی ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ آیات احکام کی ایک تہائی تعداد عبادات کے بارے میں ہے اور ایک تہائی خاندانی زندگی کے بارے میں ہے۔ بقیہ

ایک تہائی کا تعلق زندگی کے بقیہ پہلوؤں سے ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن نے خاندانی زندگی کے تحفظ کو کتنی اہمیت دی ہے۔ قرآن مجید نے ہر ایسی کوشش کو جس کا مقصد خاندان میں افتراق پیدا کرنا ہو شیطان کی سحر کاری قرار دیا ہے اور اس کو ایک کافرانہ عمل ٹھہرایا ہے۔

قرآن مجید اگرچہ کلیات کی کتاب ہے اور اس میں عمومی احکام اور کلی ہدایات دی گئی ہیں لیکن اس کا اسلوب کسی قانون، اصول قانون یا آئین و دستور کی فنی کتاب کا سا نہیں ہے۔ اس کتاب میں عمومی قانونی ہدایات و کلیات کو جزوی مثالوں اور واقعات کے پردے میں بیان کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے قارئین کی علمی، فکری اور ذہنی سطحیں بے شمار ہیں۔ اس لیے اس کا اسلوب ایسا ہے کہ اس کو ہر شخص اپنی سطح اور فہم کے مطابق سمجھ سکتا ہے۔ قرآن مجید کے کلیات اور عمومی اصولوں کو حقائق زندگی کے پس منظر میں برتنے کا ڈھنگ سیرت اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوتا ہے۔ سنت قرآن مجید کی تشریح بھی کرتی ہے، تفصیلات بھی بیان کرتی ہے اور مجملات قرآن کی تعیین بھی کرتی ہے۔ اگرچہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم براہ راست مستقل بالذات احکام بھی دے سکتی ہے، تاہم بعض بالغ نظر اہل علم کا کہنا ہے کہ سنت کے دیئے ہوئے ہر حکم کی کوئی نہ کوئی اساس قرآن پاک میں موجود ہوتی ہے اور غور کرنے سے سامنے آجاتی ہے۔

۳۔ اخلاق

تیسرا اہم مبحث اخلاق ہے، جس کا تعلق انسان کے قلبی احساسات اور تاثرات سے ہے۔ انسان بعض چیزوں کو پسند کرتا ہے اور بعض کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے، جب کہ کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن سے اس کو شدید نفرت ہوتی ہے۔ یہ

پسندیدگی، ناپسندیدگی اور نفرت انسان کے قلبی احساسات کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ قلبی احساسات بعض اوقات اچھے ہوتے ہیں اور بعض اوقات خراب۔ انسان کے احساسات اچھے ہوں تو ہر چیز اس کو اچھی نظر آتی ہے۔ احساسات خراب ہوں تو انسان مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے اور ہر چیز بگڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو روز اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ اگر آپ خوش ہیں اور قلبی اور ذہنی کیفیت کے اعتبار سے انبساط کی حالت میں ہیں تو آپ کو ہر چیز اچھی نظر آئے گی اور اگر خدانخواستہ کوئی شخص آپ کو کوئی بری خبر سنا دے تو آپ کو سارا ماحول پژمردہ نظر آنے لگتا ہے۔ گویا انسان کا دل اس کی جذباتی زندگی میں ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ جب تک اس کے قلبی احساسات ٹھیک رہتے ہیں، اس کو ساری کائنات ٹھیک لگتی ہے اور اگر قلبی احساسات بگڑ جائیں تو ساری کائنات بگڑی ہوئی لگتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کائنات اپنی جگہ رہتی ہے، وہ جیسی پہلے تھی ویسی ہی آج بھی ہے۔ نہ وہ خوش ہوتی ہے اور نہ ناخوش، نہ وہ مسرت سے بھلتی ہے اور نہ کسی وجہ سے غم ناک ہوتی ہے یہ محض انسان کا دل ہے جو انسان کو کچھ کا کچھ دکھاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا:

ان في الجسد مضغة. اذا صلحت صلح الجسد كله واذا فسدت فسد الجسد كله. الا وهي القلب (۱۵)

دیکھو انسان کے اندر گوشت کا ایک لوتھڑا ہوتا ہے، جب تک وہ ٹھیک رہتا ہے سارا جسم ٹھیک رہتا ہے، جوں ہی وہ بگڑتا ہے سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ اور یاد رکھو وہ لوتھڑا انسان کا دل ہے۔

یہ بات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے محض کسی طبی اور جسمانی مفہوم میں ارشاد نہیں فرمائی، اگرچہ اس مفہوم میں بھی یہ بات بالکل درست ہے۔ لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ

والسلام کا ارشاد گرامی اخلاقی اور روحانی مفہوم میں ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشارہ انسان کے جذبات و عواطف اور احساس و کردار کی طرف ہے۔ انسان جذباتی طور پر متوازن رہے تو اس کی پوری زندگی توازن کا نمونہ بنی رہتی ہے۔ اور اگر کسی وجہ سے انسان جذباتی عدم توازن کا شکار ہو جائے تو پوری زندگی غیر متوازن ہو جاتی ہے۔ اس سے صاف پتہ چلا کہ ایک کامیاب اور متوازن زندگی گزارنے کے لیے انسان کے قلبی احساسات کی درستی اور جذباتی توازن انتہائی اہمیت کی حامل چیز ہے۔

قرآن مجید نے جا بجا ایسی ہدایت دی ہیں جو انسان کے احساسات کو متوازن اور جذبات کو معتدل رکھتی ہیں۔

انسان جذباتی تناؤ کا شکار جن اسباب سے ہوتا ہے ان میں سے ایک ایک کا قرآن پاک میں علاج کیا گیا ہے۔ بعض اوقات مال و دولت کی فراوانی، اقتدار و اختیار، حسن و جمال، طاقت و قوت اور ایسی ہی دوسری مادی نعمتیں انسان کا توازن بگاڑ دیتی ہیں۔ قرآن مجید نے جا بجا یاد دلایا کہ یہ چیزیں جہاں خالق کائنات کی طرف سے ایک عظیم نعمت ہیں وہاں یہ ایک آزمائش کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ اگر ایک صاحب ایمان ان میں سے ہر نعمت کے ملنے پر شکر کا رویہ اختیار کرے تو وہ بہکنے سے محفوظ رہتا ہے۔ شکر کا رویہ نہ ہو تو ان نعمتوں کا نشہ انسان کو بہکا دیتا ہے اور وہ توازن کی راہ راست سے بھٹک کر عدم توازن کی سنگلاخ پگڈنڈیوں پر نکل جاتا ہے، اور پھر جتنا وہ اس راستے پر بڑھتا چلا جاتا ہے اس کے عدم توازن میں اضافہ اور زندگی کی ناکامیوں میں زیادتی ہوتی جاتی ہے۔

اسی طرح اگر آزمائش کی گھڑیوں میں انسان ہمت ہار جائے اور صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دے تو بھی وہ بہت جلد عدم توازن کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسانی مزاج کی

اس اہمیت کے پیش نظر قرآن مجید نے اپنی تعلیم کا ایک اہم حصہ اس پہلو کو ابھار اور مستحکم بنانے کے لیے خاص کیا ہے۔ قرآن پاک کی یہ تعلیم جس کے لیے تزکیے اور احسان کی اصطلاحات استعمال کی گئی ہیں انسان کے جذبات و احساسات کو متوازن اور منضبط رکھنے میں مدد دیتی ہے۔

تقدیر پر ایمان محض ایک کلامی مسئلہ نہیں ہے، بلکہ یہ عقیدہ انسان کو ہر ذہنی اور جذباتی لمحے میں زیور اعتدال و توازن سے آراستہ رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں جا بجا اہل ایمان کو یہی درس دیا گیا ہے کہ زندگی میں آنے والی ہر قسم کی خوشی اور غمی، سختی اور نرمی، اچھائی اور برائی، بیماری و صحت، کامیابی اور ناکامی، فتح اور شکست غرض سب کچھ اللہ کی مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ انسان کا کام صرف یہ ہے کہ حتی المقدور جائز اسباب اور وسائل اختیار کرے اور نتیجے کو اللہ کی ذات پہ چھوڑ کر اس کے فیصلے پہ راضی رہے۔

تقدیر پہ ایمان کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان ہمہ وقت ایک احساس حضوری کے ساتھ زندگی گزارے اور ہر لمحے یہ شعور دل میں بیدار رکھے کہ وہ خالق کائنات کی مسلسل نگرانی میں ہے۔ نگرانی کا یہ احساس اس کو نہ صرف بہت سی برائیوں اور کمزوریوں سے محفوظ رکھتا ہے بلکہ اوامر الٰہی کی پابندی اور نواہی سے اجتناب میں بھی ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ حضوری کی یہ کیفیت جس کو حدیث پاک میں احسان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ قرآن مجید میں جا بجا احسان کی ہدایت کی گئی ہے اور احسان کرنے والوں کو اللہ کا محبوب بتایا گیا ہے۔ قرآن پاک کی ان ہی ہدایات کی بنیاد پہ اکابر اسلام نے تزکیے اور احسان کے اصول اور قواعد مرتب فرمائے اور ان کو ایک باضابطہ علم کی شکل دی۔ علمائے دین کا یہ مقدس گروہ جن کو

علامہ اقبالؒ نے اسلام کے ماہرین نفسیات قرار دیا ہے، انسانی نفس، اس کے رجحانات اور رغبات و مقاصد پر غور کرتا رہا ہے۔ ان حضرات نے انسانی کمزوریوں کا پورا پورا احساس و ادراک کرتے ہوئے تزکیے اور احسان کے حصول کے لیے بہت سی تدابیر تجویز فرمائیں، جن کو ایک جداگانہ فن کی صورت میں مرتب کر دیا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دیگر انسانی کاوشوں کی طرح اس فن میں بھی بہ تقاضائے بشری بہت سا رطب و یابس بھی داخل ہو گیا ہے۔

۴۔ ایام اللہ

قرآن پاک کا چوتھا بنیادی مبحث حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے الفاظ میں ایام اللہ کہلاتا ہے۔ ایام اللہ سے مراد اللہ کی سنت کے مطابق دنیا کی تاریخ میں مسلسل جاری رہنے والا نشیب و فراز ہے جس کے نتیجے میں افراد اور قوموں کے عروج و زوال کی مثالیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ قرآن مجید کا ہر طالب علم اس بات کو جانتا ہے کہ اس کتاب میں اقوام سابقہ اور انبیائے سابقین میں سے بہت سوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ سورۃ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ سے جو دعا کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے راستے پر چلائے جن پر اس نے انعام فرمایا اور ان لوگوں کے راستے سے محفوظ رکھے جن پر اس کا غضب نازل ہوا یا وہ راہ راست سے بھٹک گئے۔ یوں کتاب الٰہی کے آغاز سے ہی اللہ کے مقبول بندوں کا تذکرہ بھی شروع ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ لوگوں کا بھی۔ پھر آگے چل کر قرآن پاک میں بڑی تفصیل سے جا بجا انبیائے علیہم السلام کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے باغیوں کا ذکر بھی کم نہیں۔ چنانچہ فرعون، نمرود، شداد، ہامان، قارون اور ایسے ہی دوسرے لوگوں کا تذکرہ موجود ہے۔ یہ تذکرہ کہیں نام لے کر کیا گیا اور کہیں نام لیے بغیر۔

انبیائے علیہم السلام کے تذکرے میں ایک خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء میں سے کم و بیش پچیس کا تذکرہ قرآن پاک میں ملتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیائے علیہم السلام میں سے پچیس کا انتخاب کس بنیاد یا کس حکمت کے تحت کیا گیا۔ اسی طرح جن ناپسندیدہ افراد کا ذکر ہے ان کا انتخاب کس بنیاد پر کیا گیا۔

انبیائے علیہم السلام میں سے جن جن کے اسمائے گرامی قرآن پاک میں آئے ہیں ان کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک بعض خاص اوصاف و امتیازات کی نمائندگی فرماتے ہیں۔ مثال کے طور پر حضرت نوح علیہ السلام دعوت دین میں استقلال اور تحمل کی نمائندگی فرماتے ہیں۔ حضرت ایوب علیہ السلام صبر کی صفت کے مظہر ہیں۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ذات میں صفت زہد و فقر نمایاں ہیں۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی ذات میں شکر کا نمونہ ملتا ہے۔ ان تمام اوصاف حمیدہ کے لیے چلتے پھرتے نمونے ان انبیاء علیہم السلام کی صورت میں قرآن پاک میں محفوظ کر دیے گئے ہیں۔ قرآن مجید کا ایک قاری جب کتاب الٰہی کی تلاوت کرتا ہے تو اس کے سامنے بار بار مجسم اچھائیوں اور سراپا خوبیوں کے نمونے نظر آتے رہتے ہیں۔ ایک قاری یہ دیکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی نیک بندے کو اقتدار سے نوازتا ہے تو اس کا طرز عمل کیا ہونا چاہیے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی سنت اس کے سامنے آجاتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو مال و دولت اور انعامات کی فراوانی عطا فرماتا ہے تو اس کو حضرت سلیمان علیہ السلام کا رویہ اپنانا چاہیے۔ دین کی خاطر گھر بار اور وطن چھوڑنا ہو تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوہ پیش نظر رہتا ہے۔ یوں اس کی نظر میں یہ مثالیں اور نمونے ہر وقت تازہ رہتے ہیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے انبیاء علیہم السلام کے واقعات ہر وقت اس

طرح رہتے ہیں جیسے وہ خود ان کا مشاہدہ کر رہا ہو۔

سابقہ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ساتھ ایام اللہ کے ضمن میں قرآن مجید میں سیرت نبوی کے اہم واقعات بھی محفوظ کر دیے گئے ہیں۔ قرآن مجید کا ہر قاری روحانی طور پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں زندگی گزارتا ہے۔ وہ چشم تصور سے بدر وحنین کے معرکے دیکھتا رہتا ہے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ہجرت کے مناظر تازہ رہتے ہیں۔ وہ غزوہ احد میں صحابہ کرامؓ کی پریشانی اور مشکلات کو محسوس کرتا رہتا ہے اور یوں وہ چشم تصور سے واقعات سیرت کو نہ صرف دیکھتا ہے بلکہ اس کو مسلسل محسوس کرتا رہتا ہے۔ اس گہری اور مسلسل روحانی وابستگی اور چشم تصور کے ذریعے سے اس مشاہدے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسلام کے عقائد اور اخلاق اس کی طبیعت اور مزاج کا حصہ بن جاتے ہیں اور یوں انبیاء علیہم السلام کی سنت سے مسلسل راہ نمائی حاصل کرتے رہنا اس کی فطرت ثانیہ بن جاتا ہے۔

اس کے برعکس جن لوگوں نے غلط راستہ اختیار کیا ان کو کس انجام کا سامنا کرنا پڑا یہ بات بھی قرآن کے قاری کی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے پاتی۔ قرآن مجید میں اس غرض کے لیے جن لوگوں کا تذکرہ کیا گیا ان میں ہر ایک انحراف اور سرکشی کے ایک خاص انداز کی نمائندگی کرتا ہے۔ اقتدار کے نشے میں انسان راہ راست سے بھٹک جائے تو کہاں جا کر دم لیتا ہے۔ یہ چیز فرعون کے انجام کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ مال و دولت کی بہتات کے نتیجے میں انسان راہ راست سے بھٹک جائے تو کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ یہ چیز قارون کے انجام سے پتہ چلتی ہے۔ بعض اوقات انسان کے اپنے پاس نہ دولت ہوتی ہے نہ اقتدار لیکن اس کو کسی صاحب اقتدار کی مصاحبت میسر آ جاتی ہے۔ شہر میں اس کی اپنی کوئی آبرو نہیں ہوتی لیکن شاہ کا مصاحب بن کر اتراتا پھرتا ہے اور یوں

اس کا ذہن فساد کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ اس کے لیے قرآن مجید میں فرعون کے مصاحب ہامان کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ہامان فرعون کا مصاحب تھا اور صحبت بد نے اس کا دماغ خراب کر دیا تھا۔

ان چیزوں کے ساتھ ساتھ برے لوگوں کی رشتہ داری بھی بعض اوقات انسان کو گمراہ کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ قرآن مجید نے مختلف رشتہ داریاں بیان کر کے یہ بتایا ہے کہ کسی کی محض رشتہ داری نہ انسان کو اچھا بنا سکتی ہے اور نہ برا، اگر وہ خود اچھا یا برا نہ بننا چاہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں مختلف مشہور اور بڑی شخصیتوں کے رشتہ داروں کا تذکرہ بھی اسی سیاق و سباق میں کیا گیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ، حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے، حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی کا تذکرہ اللہ کے باغیوں کی فہرست میں کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام قریبی اعزہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں کی ٹھنڈک بنے اور اسلام کے سابقین اولین میں شامل ہوئے۔ البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک بدنصیب چچا ابولہب تھا جو اس فہرست میں شمولیت کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ اچھے لوگوں کے نالائق رشتہ داروں کے ساتھ نالائق لوگوں کے اچھے رشتہ داروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ چنانچہ فرعون کی تمام تر گمراہیوں اور سرکشیوں کے باوجود اس کی اہلیہ جناب آسیہ تقوے اور دینداری کے بہت بلند معیار پر فائز رہیں اور ان کو نیکی اور خلوص کی ایک لازوال مثال کے طور پر بیان کیا گیا۔

یہ تمام واقعات و تفصیلات عبرت اور سبق آموزی کی خاطر بیان کیے گئے تھے۔ اس لیے ان کا صرف اتنا حصہ بیان کرنے پر اکتفا کیا گیا جو سبق آموزی کے لیے مفید اور ضروری تھا۔ ان واقعات کی وہ تفصیلات جو سبق آموزی کے لیے ضروری نہ تھیں نظر انداز کر دی گئیں، اس لیے کہ قرآن مجید کتاب ہدایت ہے، یہ کوئی تاریخ یا آثار

قدیمہ کی کھتونی نہیں۔

قرآن مجید کا آخری بنیادی مبحث مرنے کے بعد دوسری زندگی کے حالات اور ان کی تفصیلات ہیں۔ ایک اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ مضمون عقائد سے تعلق رکھتا ہے، اس لیے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کا تعلق عقیدہ آخرت ہی سے ہے لیکن چوں کہ قرآن نے اس مضمون کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے اس لیے علمائے کرام اور مفسرین نے اس کو ایک جداگانہ مبحث قرار دیا ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اس کے لیے تذکیر بالموت و مابعد الموت کی اصطلاح اختیار فرمائی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حیات بعد الموت کی تفصیلات بیان کرنے، ان کو ذہن نشین کرانے اور عقیدہ آخرت کو اہل ایمان کے رگ و پے میں سمو دینے میں کوئی اور مذہبی کتاب قرآن مجید کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ قرآن مجید نے جس تفصیل اور باریک بینی کے ساتھ قیامت کے مناظر کی نقشہ کشی کی ہے وہ نہ صرف مذہبی لٹریچر کی تاریخ میں بلکہ ادبیات عالم میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ نہ صرف مسلمان علما بلکہ غیر مسلم اہل علم نے بھی قرآن پاک کے اس پہلو کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے۔ بیسویں صدی کے مسلمان ادیبوں اور محققین میں مصر کے سید قطب شہید کا نام اس معاملے میں بڑا نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنی کتاب "مشاہد القیامہ فی القرآن" میں قرآن پاک کے اس پہلو پر انتہائی عالمانہ اور ادیبانہ انداز سے گفتگو کی ہے۔

روز قیامت کے مناظر و مشاہد قرآن مجید کی ابتدائی سورتوں سے لے کر آخر تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سکرات موت کا تذکرہ بھی ہے۔ مرنے کے بعد عالم برزخ کے سوال جواب، قبر کی کیفیات و تجربات، مرنے والے کے روحانی احساسات سے لے کر جنت اور دوزخ کے مناظر تک ہر ہر مرحلے کی جھلکیاں موجود ہیں۔

یوں تو یہ مضمون قرآن مجید کے ہر حصے میں ملتا ہے لیکن کئی سورتیں اس معاملے میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کئی سورتیں یوں بھی اپنے غیر معمولی زورِ بیان، خطیبانہ اسلوب اور اثر انگیزی میں ممتاز ہیں۔ یہ اسلوب، یہ انداز اور یہ اثر انگیزی مناظرِ قیامت کے ضمن میں اس آخری حد تک آشکار ہو جاتی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کوئی صاحب ایمان عربی زبان کی فہم رکھتا ہو اور قرآن مجید کے مضامین سے واقف ہو، ان آیات کو پڑھے اور ان سے اثر نہ لے۔ ایسے واقعات سیکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں ہیں کہ اللہ کے نیک بندے آیات قیامت کو پڑھ کر یا سن کر تڑپ تڑپ گئے، بے قابو ہو گئے اور دھاڑیں مار مار کر رو پڑے۔ ایسے واقعات بھی لاتعداد ہیں جن میں آیات قیامت کو پڑھنے یا سننے والے بے ہوش ہو ہو کر گر پڑے۔ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ بعض صحابہ اور تقویٰ شعار بزرگ تمام رات ایک ہی آیت کو دہراتے رہے۔ یہی ان آیات کا مقصد ہے اور شاید اسی لیے یہ خصوصی انداز اس مضمون کے ضمن میں اختیار فرمایا گیا ہے۔

یہ تھے وہ پانچ بنیادی مباحث و مضامین جن سے قرآن پاک میں بیشتر آیات اور سورتوں میں بالواسطہ یا بلاواسطہ کلام کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر مضمون کا تعلق قرآن مجید کے اصل مقصد اور مرکزی مضمون سے ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔

نزولِ قرآن نجماً نجماً کیوں؟

اتنی بات تو قرآن مجید کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ یہ کتاب دنیا کی دوسری تمام مذہبی کتابوں سے کئی اعتبار سے مختلف ہے۔ اس کا اسلوب، انداز بیان اور طرز استدلال اتنا منفرد ہے کہ دوسری تمام مذہبی کتابوں کے متن اور عبارت سے قرآن مجید کا متن اور عبارت واضح طور پر مختلف نظر آتے ہیں۔ ان امتیازی اوصاف میں ایک اہم وصف قرآن پاک کا اندازِ نزول ہے۔ اندازِ نزول کے اعتبار سے قرآن مجید اور دوسری آسمانی کتابوں میں دو اعتبار سے بڑا فرق پایا جاتا ہے۔ یہ فرق بڑی بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ اتنی بنیادی اہمیت کہ اس فرق کی وجہ سے قرآن مجید کو دوسری تمام آسمانی کتابوں پر ایک نمایاں فضیلت اور برتری حاصل ہے۔

قرآن مجید سے پتہ چلتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل فرمانے کا ارادہ کیا تو ان کو ایک ماہ کے اعتکاف کے لیے طورِ سینا پر بلایا اور پھر اس میں دس دن کی توسیع خود فرمائی اور ۴۰ دن کے اعتکاف کے بعد ان کو پوری کی پوری تورات تختیوں کی شکل میں لکھی ہوئی دے دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان تختیوں کو لے کر آگئے اور اپنی قوم کے سامنے پیش کر دیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ

تختیاں سونے کی تھیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ وہ پتھر کی تھیں۔ یہ بہرحال ہمارے نقطۂ نظر
کے لحاظ سے ایک غیر متعلق بات ہے۔ یہ تختیاں جس دھات یا جس چیز پر بھی لکھی ہوئی
تھیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دے دی گئیں اور انہوں نے وہ تختیاں لا کر اپنی قوم کو
دے دیں۔ اس طرح قوم موسیٰ نے تورات کے پیغام کو حاصل کر لیا اور اس کو پڑھنے
پڑھانے میں لگ گئے۔ وہ تختیاں طویل عرصے تک نسلاً بعد نسلٍ بنی اسرائیل میں چلتی
رہیں۔ بنی اسرائیل کی تاریخ میں بہت سے نشیب و فراز آتے رہے۔ ایک مرحلہ ایسا آیا
کہ یہودیوں کو زبردست تباہی اور بربادی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی سلطنت ختم ہوئی، ان
کے لاکھوں آدمی موت کے گھاٹ اتارے گئے۔ انہی ہنگاموں میں تورات کی تختیاں
ضائع ہو گئیں اور پھر تورات دنیا سے مٹ گئی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل نازل فرمائی گئی تو انجیل جس شکل میں حضرت
عیسیٰ پر نازل کی گئی اس کی شکل قرآن مجید اور تورات دونوں سے مختلف تھی۔ انجیل کے
نزول کی صورت وہ نہیں تھی جو قرآن مجید کی یا تورات کی تھی۔ بلکہ انجیل کی حیثیت
قریب قریب وہ تھی جو مسلمانوں میں حدیث قدسی کو حاصل ہے۔ حدیث قدسی علم حدیث
کی اصطلاح میں اس حدیث کو کہتے ہیں جو دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو اور اللہ
تعالیٰ ہی کا براہ راست کلام جو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ذریعے ہم تک پہنچا ہو لیکن
حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو اپنے الفاظ میں بیان فرمایا ہو تو وہ حدیث قدسی
ہے۔ مثلاً ایک حدیث آپ نے سنی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

جب میرا بندہ میری طرف ایک بالشت بڑھتا ہے تو میں اس کی
طرف ایک گز آگے بڑھتا ہوں۔ جب میرا بندہ آہستہ سے میری
طرف آتا ہے تو میں لپک کر اس کی طرف بڑھتا ہوں۔ [illegible]

سے میری طرف دوڑ کر آتا ہے تو میں اور تیز دوڑ کر اس کے پاس

جاتا ہوں۔

یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اسی کی طرف سے ارشاد ہو رہا ہے۔ لیکن یہ قرآن پاک نہیں ہے۔ اس لیے کہ قرآن پاک کے برعکس اس کے الفاظ اللہ کی طرف سے وحی کردہ نہیں ہیں بل کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہیں۔

انجیل کے نزول کی کیفیت تقریباً اسی طرح کی تھی کہ اللہ رب العزت نے ایک پیغام حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قلب مبارک پر نازل کیا اور انھوں نے اس کو اپنے الفاظ میں انسانوں تک پہنچا دیا لیکن اس کو لکھا نہیں۔ نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کچھ تحریر کروایا، نہ ان کے ماننے والوں نے ان کی زندگی میں ان کے پیغام کو لکھا۔ بس زبانی ہی وہ پیغام چلتا اور پھیلتا رہا۔ وہ پیغام کتنا بڑا تھا؟ کتنا مختصر تھا؟ اگر لکھتے تو ایک کتاب بنتی یا دو کتابیں بنتیں؟ کتنے صفحے بنتے؟ ان سب سوالات کا جواب ہمارے پاس نہیں ہے۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے انجیل کو قلم بند نہیں کرایا۔ اس کی روایت زبانی ہی چلتی رہی لیکن بہرحال وہ کلام جتنا کچھ بھی تھا وہ ایک ہی وقت میں سارا کا سارا نازل ہو گیا۔

اس کے برعکس قرآن مجید کے نزول کا سلسلہ اس سے بالکل مختلف انداز میں طویل عرصے تک جاری رہا۔ قرآن مجید لمحاً لمحاً یعنی تھوڑا تھوڑا کر کے، کبھی ایک ایک لفظ، کبھی ایک آیت، کبھی ایک ایک سورت کر کے ۲۳ سال کے طویل عرصے میں نازل ہوا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نزول وحی کے کل واقعات یا تجربات ۲۴ (Experiences) ہزار ہیں۔ یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر چوبیس ہزار مرتبہ وحی نازل ہوئی۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں چوبیس ہزار مرتبہ میں قرآن مجید کے مختلف

حصے اور اس کے تفسیری اشارات حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئے۔ بعض آیات، بعض سورتیں اور بعض اجزاء ایسے ہیں جو ایک سے زائد مرتبہ نازل ہوئے۔ اس لیے کہ مصلحت اسی بات کی متقاضی تھی کہ ان حصوں کو بار بار نازل کیا جائے۔ مثال کے طور پر روایت میں آتا ہے کہ سورۃ الفاتحہ کئی بار نازل ہوئی۔ ایک مرتبہ سلسلہ وحی کے بالکل آغاز میں اس کا نزول ثابت ہوتا ہے۔ پھر جب پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوئیں تو یہ پھر نازل ہوئی۔ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ مدینہ منورہ میں بھی ایک بار نازل کی گئی۔ خلاصہ یہ کہ بعض ایسی اہم سورتیں جو قرآن پاک میں بہت مہتم بالشان حیثیت رکھتی ہیں وہ ایک سے زائد مرتبہ بھی نازل کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ بعض اوقات صرف ایک ہی لفظ نازل کیا گیا۔ بعض اوقات پوری پوری سورت نازل کی گئی اور ایسی بھی مثالیں ہیں کہ بڑی لمبی لمبی سورتیں جیسے سورۃ یوسف جو آدھے پارے سے زائد پر مشتمل ہے ساری کی ساری ایک ہی مرتبہ ایک ہی بار نازل ہوئی۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ اور اس سوال کا جواب ہی وہ بنیادی امتیازی وصف اور غیر معمولی حقیقت ہے جس نے قرآن پاک کو تمام دیگر آسمانی کتابوں کے مقابلے میں بڑی نمایاں حیثیت اور ممتاز خصوصیت عطا کی ہے۔ اس سوال پر غور کیا جائے تو قرآن مجید نجماً نجماً (تھوڑا تھوڑا کر کے) نازل کیے جانے کی متعدد حکمتیں واضح ہوتی ہیں۔ آئندہ چند صفحات میں ان حکمتوں میں سے چند کا تذکرہ مقصود ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جب اللہ رب العزت نے اپنی مشیت میں قرآن مجید کے نزول کا فیصلہ کیا تو اس کتاب کو اس نے کسی خلا میں اتارنے کا فیصلہ نہیں کیا، بلکہ یہ کتاب اللہ رب العزت نے ایک زندہ ماحول میں، ایک زندہ معاشرے

میں اور ایک ایسے وقت میں اتاری جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سربراہی میں دین کو قائم کرنے، دین کی تبلیغ کرنے اور دین کو پھیلانے کی ایک بھرپور کوشش جاری تھی۔ جیسا کہ ہر صاحب علم جانتا ہے، اس کوشش کا مقصد انسانی زندگی کے کسی ایک پہلو کی اصلاح نہیں بلکہ زندگی کے سارے کے سارے پہلوؤں کی مکمل اصلاح تھا۔ اس تحریک اور جدوجہد کا بنیادی ہدف یہ تھا کہ ایک طرف انسان کے عقائد کی اصلاح ہو، دوسری طرف انسان کے جذبات اور احساسات کو مثبت جہتیں عطا ہوں۔ جہاں انسان کی ذاتی اور شخصی زندگی کے طور طریقے بدلیں وہیں انسان کی معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں بھی صحت مندانہ تبدیلی آئے۔ ایک طرف تجارت وکاروبار کا انداز بدلے تو دوسری طرف اجتماعی حالات بھی بدلیں۔ جہاں معاشی حالات خیر کا رخ اختیار کریں وہیں سیاسی احوال کو بھی بہتری کے رخ پر ڈالا جائے۔ غرض زندگی کا ہر ہر پہلو اور انسان کی سرگرمیوں کا ہر ہر جزئی اقدار کے مطابق بدل جائے۔

یہ تھا وہ عظیم الشان کام جس کے لیے قرآن پاک کا نزول شروع ہوا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی راہ نمائی اور سرپرستی اور صحابہ کرامؓ کی مدد اور تعاون سے یہ تاریخ ساز اور جاں گسل جدوجہد تیئیس سال سے زیادہ مدت تک جاری رہی۔ اس پورے عرصے میں جدوجہد کے جس مرحلے پر جب اور جہاں جس راہ نمائی کی ضرورت پیش آتی قرآن پاک کی آیات نازل ہو جاتیں اور ضروری راہ نمائی فراہم کر دیتیں، اور یوں دین کی نشر و اشاعت کی تمام کوششیں، اقامت دین کی جدوجہد اور ایک مثالی اسلامی معاشرے کی تشکیل اور نزول قرآن کا عمل یہ سب چیزیں نہ صرف جاری رہیں، بلکہ ایک دوسرے کی مدد و معاون اور مکمل (تکملہ) بھی رہیں۔ اس اعتبار سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن پاک ایک انقلابی انداز کی وحی یعنی Revolutionary

Revelation ہے۔ واضح رہے کہ یہاں انقلابی کا لفظ عام سیاسی مفہوم میں استعمال
نہیں کیا جا رہا بلکہ یہاں انقلاب سے مراد ایک ایسی ہمہ گیر تبدیلی ہے جو اس کتاب
محکم اور قرآن مجید کے نزول کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ ایسا انقلاب یا کامل تبدیلی ہے جو
اس کتاب محکم اور قرآن مجید کے نزول کے نتیجے میں پیدا ہوئی۔ اس انقلاب یا کامل
تبدیلی کے مختلف مراحل کا ارتقا اور کتاب الٰہی کے نزول کے مختلف مدارج کی تکمیل کے
دونوں عمل ایک ساتھ جاری رہے۔ جوں ہی اس کتاب کے نزول کی تکمیل ہوئی ویسے ہی
اس ہمہ گیر تبدیلی اور انقلاب کی بھی تکمیل ہوگئی۔ گویا یہ تبدیلی جو قرآن مجید کے ذریعے
سے وجود میں آئی ایک ہمہ جہتی بنیادی تبدیلی Revolutionary revelation تھی۔

یہی وجہ ہے کہ جس دن یہ آیت نازل ہوئی:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ
وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۱۲)

آج کے دن ہم نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر
اپنی نعمت تمام کر دی اور اسلام کو بطور ایک طرز زندگی تمہارے لیے
پسند کر لیا۔

تو اس دن کئی لوگ بشمول صحابہ کرامؓ نے یہ سمجھ لیا کہ جو کام حضور علیہ الصلوٰۃ
والسلام کرنا چاہتے تھے وہ سارا کام مکمل ہو چکا ہے اور اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس
دنیا سے تشریف لے جانے والے ہیں۔ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس موقع پر جو
وہ موقع حجۃ الوداع کا تاریخی موقع تھا، صحابہؓ سے پوچھا کہ کیا میں نے امانت پہنچادی؟
صحابہؓ نے بیک زبان گواہی دی کہ ہاں آپ نے امانت پہنچادی۔ گویا یہ سب کام یعنی
تکمیل نزول قرآن، تکمیل انقلاب، پہنچائی امانت اور تکمیل دین سب ایک ساتھ ہوئے

ہوتے ہوئے امت کو کارِ نبوت کے لیے تیار کرنا اور امت کو وحی الٰہی کی تعلیم میں رچا بسا دینا اور افراد و ملت کو وحی الٰہی کے رنگ میں رنگ دینا ضروری نہیں تھا۔ اس لیے کہ اس امت کا وہ کام نہیں تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ختمی مرتبت کی امت کے سپرد کیا جانا تھا۔ اب جب کہ نبوت ختم ہو چکی تو جہاد بالقرآن کی یہ ذمے داری حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جانشین کی حیثیت سے ساری امت کو انجام دینی ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جس طرح مستخلِف (بکسر اللام) کان خلقہ القرآن سے متصف تھا۔ اسی طرح مستخلَف (بفتح اللام) بھی کان خلقہ القرآن کی نعمت سے بہرہ یاب ہو۔ یعنی قرآن کا رنگ اس میں رچا بسا ہو اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اس کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہو۔ امت کو قرآن پاک کے رنگ میں رنگنے کے لیے ضروری تھا کہ یہ رنگ تھوڑا تھوڑا کر کے چڑھایا جائے کہ رنگ پختہ ہوتا چلا جائے۔

تیسری وجہ قرآن پاک کے آہستہ آہستہ نازل کیے جانے کی یہ ہے کہ کفار مکہ نے (جیسا کہ خود قرآن پاک میں بیان ہوا ہے) یہ اعتراض کیا تھا:

لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (۳۲)

اس قرآن کو ایک ہی بار کیوں نہ اتار دیا گیا۔

قرآن پاک نے اس کا جواب یوں دیا:

كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ○

ہم نے تھوڑا تھوڑا کر کے اس لیے اتارا ہے کہ ہم اس طرح آپ کے دل کو مضبوط کریں، تقویت دیں، اور اس کی وجہ سے سکون و اطمینان بخشیں اور آپ کو پختگی حاصل ہو، مزید برآں ہم اس کو آہستہ آہستہ تھوڑا کر کے لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔

اس آیت میں مذکورہ بالا اعتراض کے دو جواب دیے گئے ہیں اور ان دونوں جوابوں کے ذریعے دو اور حکمتیں اس بات کی بیان کی گئی ہیں کہ قرآن پاک کو آہستہ آہستہ کیوں نازل کیا گیا۔ اصل جواب سمجھنے سے پہلے ایک اور اہم بات سمجھ لینی چاہیے اور وہ یہ ہے جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن پاک اپنی ترتیب، نفس مضمون اور اسلوب بیان کے اعتبار سے ایک بڑی منفرد کتاب ہے۔ یہ اس مفہوم میں محض قانون یا آئین کی کتاب نہیں ہے جس طرح کی قانون کی کتابیں وکیلوں کی لائبریریوں میں ہوتی ہیں۔ اگر چہ اس میں قانون کے بھی بہت سے احکام دیے گئے ہیں، اور دستوری اہمیت کے بہت سے اصول بھی بیان ہوئے ہیں۔ لیکن قانونی احکام کے ساتھ ساتھ اس کتاب میں ان کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ قرآن پاک محض معاشیات کی کتاب بھی نہیں ہے۔ اگر چہ اس میں معاشیات اور معاشی زندگی کے احکام بھی ہیں اور انسانوں کی تجارتی سرگرمیوں اور اقتصادی بہتری کی ہدایات بھی ہیں۔ لیکن اور بھی بہت کچھ ہے۔ اسی طرح قرآن پاک محض فلسفے کی کتاب بھی نہیں ہے، گو اس میں فلسفیانہ نوعیت کی بہت سی ہدایات بھی ہیں، لیکن اس میں فلسفے کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔

قرآن پاک میں چوں کہ انسانی زندگی کے ہر اس پہلو سے متعلق ہدایت موجود ہے جہاں انسانی عقل، تجربہ اور مشاہدہ ناکام ہو جاتے ہوں یا جہاں ان کے ناکام ہونے کا قوی احتمال ہو اور جہاں انسان راہ نمائی کی ضرورت محسوس کرتا ہو، اس لیے زندگی کا کوئی اہم گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں انسان کو راہ نمائی اور ہدایت کی ضرورت ہو اور قرآن پاک اس میں راہ نمائی نہ دیتا ہو۔ اس لیے جب بھی کوئی انسان، چاہے وہ ایک فرد ہو، یا پوری جماعت یا معاشرہ ہو، جب دین کی نشر و اشاعت کے لیے اور اس کو قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرے گا تو اس کو طرح طرح کے عوارض و

مراحل سے واسطہ پڑے گا۔ بعض اوقات مخالفین کی طرف سے اعتراضات کئے جائیں گے، بعض اوقات مشکلات اور آزمائشیں ہوں گی، بعض اوقات کامیابیاں ہوں گی، بعض اوقات ناکامیاں ہوں گی۔ کبھی قید و بند کا سامنا کرنا پڑے گا۔ کبھی طرح طرح کی آزمائشیں آئیں گی۔ اب چوں کہ ان سب مراحل کو ایک ایک کرکے آنا ہے اس لیے ان میں سے ہر چیز کے بارے میں ایک راہ نمائی اور ہدایت کا دست یاب ہونا بھی ضروری ہے۔ مثلاً یہ بات کہ اگر اقامت دین کی کوشش میں قید و بند کا نشانہ بننا پڑے تو کیا کرنا چاہئے۔ قرآن مجید نے اس سوال کے جواب میں جہاں اور بہت سی ہدایات دیں وہاں پوری سورۂ یوسف پیش کردی کہ تمہیں اس طرح کرنا چاہئے۔ اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ قرآن پاک میں حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کی زندگی کے قریب قریب سارے ہی اہم واقعات بیان کردیئے گئے ہیں۔ غزوہ بدر کا بھی ذکر ملتا ہے اور غزوۂ احد کا بھی، غزوہ احزاب کا تذکرہ بھی ہے اور فتح مکہ کا بھی۔ تبوک کے طویل اور جاں گسل سفر پر تبصرہ بھی ہے اور ہوازن کے معرکے پر بھی۔ اس طرح کار نبوت اور کار دعوت کے آغاز کا بیان بھی ہے، درمیانی مدارج کا بھی ذکر ہے اور انتہائی مدارج کا بھی۔ اس لیے کہ مسلمانوں کی زندگیوں میں یہ ساری چیزیں ایک ایک کرکے پیش آتی رہیں گی۔ جو مسلمان حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیروی میں جدوجہد کریں گے وہ ہجرت بھی کریں گے، ان کو جہاد کرنے کی بھی نوبت آئے گی، کبھی انہیں جہاد میں کام یابی ہوگی اور کبھی ناکامی بھی ہوگی۔ کبھی بہت بڑی قوت کا سامنا کرنا پڑے گا تو کبھی چھوٹی قوت سے معرکہ آرائی ہوگی۔ کبھی محاصرہ ہوگا، کبھی کھیتیاں اجڑیں گی۔ غرض کہ یہ سارے مراحل آئیں گے۔ ان سارے مراحل میں یہ دیکھنا چاہئے کہ اہل ایمان کا رد عمل کیا ہوتا ہے۔ اب یہاں تثبیت فواد یعنی دل کو مضبوط کرنے سے مراد یہ ہے کہ تمہارے دل کو تسلی رہے

کہ یہ مشکل وقت تو آنا ہی تھا۔ پہلے سے معلوم تھا کہ فلاں فلاں مراحل آئیں گے۔

اس بات کو ایک مثال کے ذریعے واضح کیا جاسکتا ہے۔ اگر ایک بار معالج اپنے کسی مریض کو دواؤں کے استعمال کی تفصیل بتا کر علاج کا تین مہینے کا کورس کرائے اور اس کو پہلے سے بتا دے کہ ان دواؤں کے استعمال سے ایک ہفتے کے بعد پھنسیاں نکلیں گی، اور پھر دانے نکلیں گے تو اس وقت یہ مرہم استعمال کرنا ہوگا۔ اس کے استعمال سے دانے ٹھیک ہو جائیں گے۔ دو مہینے کے بعد جب اس دوا کو لگاؤ گے تو اس سے آنکھوں میں سرخی آجائے گی۔ اس موقع پر فلاں تدبیر اختیار کرنی پڑے گی۔ تین مہینے کے بعد غنودگی کا غلبہ ہوگا تو فلاں دوائیں پڑے گی۔ اب جس مریض کو پہلے سے ان سارے عوارض و مشکلات کا علم ہوگا اس کو ان بیماریوں کے آنے سے کوئی پریشانی نہیں ہوگی، اسے پتہ ہوگا کہ یہ سارے عوارض ایک ایک کر کے آنے ہی تھے۔ بلکہ جیسے جیسے یہ نئے عوارض آتے جائیں گے ڈاکٹر پر اس کا اعتماد بڑھتا چلا جائے گا، اور اس کو یقین ہوتا چلا جائے گا کہ ڈاکٹر نے جو کچھ بتایا تھا وہ بالکل ٹھیک بتایا تھا، اور دوا کے اثرات بالکل ٹھیک اور حسب توقع ہو رہے ہیں۔ اس لیے کہ یہ سب وہی مرحلے آرہے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کسی مریض کو حقیقی طور پر ان سب مدارج سے باخبر نہ کیا جائے تو وہ ان کے آنے سے گھبرا کر ہمت چھوڑ بیٹھے گا۔ وہ پہلے ہی مرحلے میں دانے نکلنے سے گھبرا جائے گا اور پریشان ہو کر علاج چھوڑ دے گا۔ حکیم مطلق نے بالکل اسی طرح جس طرح ایک حکیم ایک مریض کے لیے نسخہ لکھتا ہے کہ دیکھو یہ چیزیں پیش آئیں گی اور اس کا یہ یہ علاج ہوگا، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بھی قرآن پاک میں وہ سارے عوارض پہلے ہی بتا دیے ہیں تاکہ لنثبت بہ فؤادک تمہارے دل کو تقویت ہو اور تم مضبوطی کے ساتھ اس یقین سے اس پر قائم رہو کہ یہ سب کچھ تو آنا ہی ہے۔ یہ تو پہلے

سے معلوم تھا کہ آئے گا۔

قرآن پاک میں ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ صحابہ کرامؓ کو جب طرح طرح کی آزمائشیں پیش آئیں تو مخالفین اور منافقین نے کہا ''ہم نہ کہتے تھے مت جاؤ ان کے ساتھ''۔ مثلاً غزوہ احد میں بڑی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا۔ اس غزوہ میں ستر صحابہ شہید ہو گئے، حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا صدمہ خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دیکھنا پڑا اور جب صحابہ کرامؓ اس کیفیت میں مدینے واپس آئے تو منافقین نے استہزاء اور تمسخر سے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی۔ بولے ہم نہ کہتے تھے کہ جنگ نہیں ہونی چاہئے، ورنہ یہ ہو جائے گا اور وہ ہو جائے گا۔ اس پر قرآن پاک کی شہادت ہے کہ صحابہ کرامؓ آزمائش سے گھبرانے کے بجائے مزید پختہ عزم ہو گئے اور ان کا ایمان مزید راسخ ہو گیا۔ اسی طرح جب غزوہ احزاب کے موقع پر منافقین نے مشکلات کا ذکر کر کے بددلی پھیلانی چاہی تو صحابہ کرامؓ نے جو جواب دیا وہ اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند آیا کہ اس کو قرآن پاک میں نقل فرما دیا۔ صحابہ کرامؓ کا جواب تھا کہ یہ تو پہلے سے ہمیں معلوم تھا، اللہ اور رسول نے پہلے سے بتا رکھا تھا کہ ایسا ہوگا۔ اور اللہ اور رسول کا وعدہ کبھی جھوٹا نہیں ہوا کرتا۔ صحابہ کرامؓ کی تربیت ہی اس طرح کی ہوئی تھی کہ جب بھی کوئی نئی آزمائش سامنے آتی تھی تو بے اختیار کہہ اٹھتے تھے کہ یہ تو وہی بات ہے جو پہلے سے اللہ تعالیٰ نے بتا رکھی تھی۔ اس طرح ہر آزمائش ان کے یقین و ایمان میں اضافے اور قلب کی پختگی کا سبب بنتی تھی۔ تثبیت قلب یا دل کی مضبوطی کی خاطر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کے مختلف مرحلوں کو قرآن پاک میں جابجا محفوظ کر دیا گیا۔ اگر قرآن پاک ایک ہی وقت میں نازل ہو جاتا تو یہ بات ممکن نہیں تھی۔ ایسا نہ ہوتا تو مسلمانوں کو کیسے پتہ چلتا کہ بدر سے متعلق آیات و احکام کو آگے چل کر کس طرح بدر اور بدر سے ملتے

چلتے واقعات پر منطبق کریں۔ یہ تو اسی وقت ممکن تھا کہ جب ان آیات کو بعد کے واقعات ہی کے سیاق و سباق میں اتارا جاتا۔

قرآن پاک کو نجماً نجماً یعنی تھوڑا تھوڑا نازل کرنے کا جو پانچواں بڑا سبب ان آیات میں بتایا گیا ہے وہ یہ ہے ورتلناہ ترتیلا یعنی اور ہم نے آہستہ آہستہ اس کو ٹھہر ٹھہر کر تلاوت کیا ہے، ترتیل کے ساتھ تم تک پہنچایا ہے۔ کسی گفتگو کو ٹھہر ٹھہر کے آہستہ آہستہ، بار بار، اس طرح کہنا کہ دوسرا آدمی اچھی طرح سمجھ لے اور اس کو یاد کر لے، اس عمل کو عربی میں ترتیل کہتے ہیں۔ قرآن پاک پڑھنے کے لیے خود قرآن مجید میں ترتیل کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس میں حکم یہ دینا مقصود ہے کہ اس کتاب کو بہت آہستہ آہستہ، غور و فکر کے ساتھ، ٹھہر ٹھہر کر دوسروں تک پہنچایا جائے اور خود بھی اس کا مطالعہ کیا جائے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشیت سے طے کر دیا کہ اس کتاب کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہنا ہے، اور جب تک مسلمان روئے زمین پر موجود ہیں یہ کتاب بھی باقی رہے گی تو اس کی بقا اور تحفظ کے لیے وہ تمام تدبیریں اور جملہ طریقے اختیار کیے گئے جو کسی انسان کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں آسکتے تھے۔ یہ بالکل منفرد اور انوکھے طریقے تھے، ایسے طریقے نہ قرآن پاک سے پہلے کسی کتاب کی حفاظت کے لیے استعمال ہوئے اور نہ اس کے بعد کسی کتاب کے تحفظ کے لیے وہ طریقے استعمال ہوئے۔ انسانیت کی تاریخ میں آج تک کوئی کتاب اس طرح محفوظ نہیں کی گئی ہے کہ اس کو انسانوں کے دلوں میں، دماغوں میں اور روحوں میں اس طرح اتار دیا جائے کہ وہ ان سب کا حصہ بن جائے۔ دنیا کی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی، نہ کسی کتاب کی، نہ کتابچے کی اور نہ کسی زمانے کی کہ اس کو کروڑوں انسانوں نے زبانی یاد کر کے محفوظ کر لیا ہو اور نسلوں کی نسلوں نے اسے اپنے سینوں اور دلوں میں اتار لیا ہو، پھر ہر نسل نے اگلی نسل کے

کروڑوں آدمیوں تک پہنچا دیا ہو۔ یہ سارا عمل اس وقت ممکن ہوسکتا تھا جب صحابہ کرامؓ کو یہ قرآن تھوڑا تھوڑا پہنچایا جاتا اور تھوڑا تھوڑا یاد کرایا جاتا۔ آپ کسی کو قرآن حفظ کرانا چاہیں تو اس کی شکل یہ نہیں ہوتی کہ پوری کتاب اٹھا کے دے دیں کہ اس کو جا کے یاد کر لے۔ اس طرح یک بارگی کوئی یاد نہیں کرسکتا۔ اس کی سب سے آسان اور عملی شکل یہی ہوتی ہے کہ پہلے ایک آیت یاد کراتے ہیں۔ پھر دوسری آیت، پھر تیسری آیت، ہوتے ہوتے چند سال کی مدت میں پورا قرآن پاک حفظ ہو جاتا ہے۔

لہٰذا قرآن پاک کو نجماً نجماً یعنی تھوڑا تھوڑا کر کے تیئس سال کے عرصے میں نازل کرنے کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ صحابہ کرامؓ کو قرآن پاک کو یاد کرنے اور حفظ کر کے اس کو سینوں میں محفوظ کر لینے کا موقع مل جائے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ آہستہ آہستہ اس کو یاد کرتے چلے گئے۔ اور جوں ہی قرآن پاک کا نزول مکمل ہوا صحابہ کرامؓ میں ہزاروں کی تعداد میں ایسے لوگ تھے جن کو پورا قرآن پاک زبانی یاد تھا۔ ان سے کہیں زیادہ تعداد میں وہ تھے جن کو قرآن پاک کے متفرق حصے زبانی یاد تھے۔ پھر صحابہ کرامؓ کے حفظ کرنے کی وہ کیفیت نہیں تھی جو آج ہمارے کرنے کی ہے کہ محض الفاظ رٹ لیے گئے۔ اور جب دہرانے کا موقع آیا تو بغیر سوچے سمجھے اور بغیر کسی اندرونی تاثر کے اسے دہرا دیا۔ صحابہ کرامؓ کے ہاں کیفیت ہی اور تھی۔ حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں کہ مجھے صرف سورۃ البقرہ کا مطالعہ کرنے میں دس سال کا عرصہ لگا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان کرتے ہیں:

تعلمنا الایمان ثم تعلمنا العلم

پہلے ہم نے یہ سیکھا کہ ایمان کسے کہتے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے علم حاصل کیا۔

تو گویا پہلے ہم کی بنیاد یعنی ایمان کو ہم نے پختگی کے ساتھ حاصل کر لیا اس کے بعد اس بنیاد کے اوپر ہم نے قرآن مجید کے علم کی عمارت استوار کی۔ گویا علم اور ایمان صحابہ کرامؓ کے نزدیک ایک دوسرے کے لیے تکمیل کنندہ کا درجہ رکھتے تھے، اور یہ دونوں چیزیں صحابہ کرامؓ کے ہاں ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ علم کے بغیر ایمان کی بنیاد کمزور رہتی ہے اور ایمان کے بغیر علم خطرناک ثابت ہوتا ہے۔

بہر حال تیئس سال کے طویل عرصے میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کی پوری نسل ایسی تیار ہوئی جو قرآن پاک کے الفاظ کی بھی حافظ اور محافظ تھی، اس کے معانی کی بھی نگہبان تھی، اور اس کے مفاہیم پر بھی عمل پیرا تھی۔ ان کے دلوں میں، ان کے سینوں میں، ان کے دماغوں میں اور ان کی روحوں میں قرآن پاک کا متن، اس کا پیغام، اور اس کی روح سب رچ بس چکے تھے۔ یہ سب تب ہی ممکن تھا جب قرآن پاک تھوڑا تھوڑا یعنی تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا جائے۔

چوتھا اہم سبب قرآن پاک کے تھوڑا تھوڑا نازل کیے جانے کا ایک اور بھی ہے، جس کا اشارہ خود قرآن پاک میں ملتا ہے، اور کچھ احادیث اور روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پہلی وحی نازل ہوئی۔ (جس کی تفصیلات سے ہر پڑھا لکھا مسلمان کسی حد تک واقف ہوتا ہے) تو یہ ایک نہایت غیر معمولی تجربہ تھا جس کے اثرات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسم مبارک پر بھی نمایاں طور پر محسوس ہوئے۔ یہاں تک کہ آپ بہت ہی گھبراہٹ اور لرزے کے عالم میں اپنے دراقدس میں تشریف لے گئے اور خاصی دیر آرام فرمانے کے بعد آپ کے جسم مبارک کا لرزہ ختم ہوا اور طبیعت بحال ہوئی۔ پہلی وحی کی ان تفصیلات سے کسی حد تک اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ نزول وحی ایک نہایت غیر معمولی تجربہ ہوتا تھا جس کے واضح

اثرات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک پر بھی نمایاں طور پر محسوس ہوتے تھے۔ اس پہلے واقعے کے کچھ روز بعد جو وحی حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام پر ابتدائی دنوں میں ہی نازل ہوئی، اس میں ایک آیت ہماری اس گفتگو کے سیاق و سباق میں بڑی اہم تھی:

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا (۱۸)

ہم تم پر ایک بہت بھاری کلام اتارنے والے ہیں۔

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بھاری کلام کا کیا مطلب ہے؟ ایک مطلب بھاری کلام کا یہ ہوسکتا ہے کہ اپنے معانی اور مفاہیم کے اعتبار سے یہ ایک بہت بھرپور اور وزنی کلام ہے۔ یقیناً اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے اور اس مفہوم کے اعتبار سے قرآن مجید کے قول ثقیل ہونے میں کوئی شک نہیں کرسکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ خود قرآن پاک ہی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس کا تحمل کرنا، اس کی تلقی کرنا اور اس کی وصول یابی اتنا غیر معمولی تجربہ ہے کہ اس کو یک بارگی حاصل کرنا کسی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے، کوئی انسان چاہے وہ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہوں بہ بشری استطاعت نہیں رکھتا کہ پورے کے پورے قرآن کی تلقی یک بارگی کرسکے۔

قرآن مجید میں ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے

لَوْ أَنزَلْنَا هَٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللَّهِ (۱۹)

اگر ہم نے اس کلام کو کسی پہاڑ پر اتارا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ خوف اور خشیت الٰہی کی کیفیت میں ریزہ ریزہ ہوجاتا۔

ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال آتا ہو کہ یہ ایک بات کہنے کا محض

شاعرانہ انداز یا مبالغہ آمیز بیان ہے۔ معرفتہ ہم فی ذالک۔ اللہ تعالیٰ کے اس مبالغہ آمیز شاعرانہ انداز بیان نہیں ہوا کرتا۔ اللہ تعالیٰ کو شاعری کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ شاعرانہ مبالغہ آرائی کا محتاج نہیں ہے، اس کے شایان شان نہیں ہے کہ وہ غیر حقیقی انداز اختیار کرے، اس کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ وہ غیر حقیقی انداز اختیار کرے، اس کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ وہ عام شعراء اور محدود انسانوں کی سطح کی شاعری کی ضرورت محسوس کرے، یہ بالکل حقیقی اور واقعی طور پر اس نے فرمایا کہ اگر واقعی قرآن پاک کسی پہاڑ پر نازل کیا جاتا تو وہ پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ قرآن مجید میں ہمارے سامنے ہے کہ جب انہوں نے ایک مرتبہ درخواست تجلی الٰہی کی اس کی تو کیا منظر سامنے آیا۔ اس وقت جو منظر ہوا اور جو کیفیت ہوئی وہ قرآن مجید پڑھنے والا ہر شخص جانتا ہے۔ اس لیے یہ بات بالکل قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ قرآن پاک کا یہ یک وقت نازل کیا جاتا اتنا غیر معمولی تجربہ ہوتا اور اتنی عظیم الشان کیفیت ہوتی کہ اس کا تحمل کر لینا اور اس کی طاقت کر لینا شاید اس دنیا میں کسی انسان کے بس میں نہیں تھا۔ اس لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی کا نزول ایک طویل عرصے تک جاری رہا، اور جیسے کہ عرض کیا گیا کہ وحی الٰہی کی تحمل آپ کی ذات گرامی پر تئیس برس میں ہوئی۔

نزولِ وحی کی کیفیت

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر جب وحی نازل ہوتی تو کیا کیفیت ہوتی تھی؟ اس کا اگر کچھ اندازہ ہو تو اس سے بھی اس سوال کا جواب کسی حد تک مل سکتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نزولِ وحی کی اصل کیفیت اور اس تجربے کی حقیقی نوعیت کا اندازہ کوئی شخص کر ہی نہیں سکتا۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے خود بھی اس کو بیان نہیں فرمایا، اور وحی کوئی ایسی چیز ہے بھی نہیں کہ اس کو انسانی الفاظ میں بیان کیا جا سکے، کیونکہ وہ تو ایک منفرد تجربہ ہے جو تمام انسانی تجربات سے بالکل جدا ہے، اتنا ماوراء کہ اس کے لئے انسانوں کی زبانوں تک کوئی ایسا اسلوبِ بیان بھی موجود نہیں ہے جس کو اختیار کرکے اس تجربے کو بیان کیا جا سکے۔ لیکن صحابہ کرامؓ میں سے کچھ حضرات کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ وہ باہر سے اس کیفیت کو دیکھیں جو نزولِ وحی کے وقت سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر جسمانی طور پر وارد ہوتی تھی۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی نازل ہوتی تھی تو جو قریبی صحابہؓ وہاں موجود ہوتے تھے اور اس منظر کا مشاہدہ کرتے تھے انہوں نے اپنے بعض مشاہدات بیان کئے ہیں، جن کی نوعیت ظاہر ہے کہ حقیقی ورداتی نہیں ہے، بلکہ ان خارجی مشاہدات کی حیثیت بڑی حد تک محض ظاہری، خارجی اور لغوی معنوں میں خالص سطحی نوعیت کی ہے جس طرح سطحِ سمندر کا مشاہدہ کرنے والا سمندر کی گہرائی نہ

میں موجود تلاطم خیز طوفانوں اور موجود دنیاؤں کی گہرائیوں اور گیرائیوں کا سرے سے کوئی اندازہ ہی نہیں کر سکتا، اسی طرح نزول وحی کی کیفیت کو باہر سے دیکھنے والا سمجھ ہی نہیں سکتا کہ اس کے ابعاد کس قدر وسیع، عمیق اور ہمہ گیر تھے۔ تاہم صحابہ کرامؓ کے ان مشاہدات سے یہ اندازہ ضرور ہو جاتا ہے کہ نزول وحی کا تجربہ جسمانی مفہوم میں بھی کتنا مشکل، کتنا سخت اور کتنا غیر معمولی ہوتا تھا۔ ان واقعات سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ اگر ایک آیت یا ایک ٹکڑے کے نزول میں یہ کیفیت ہوتی تھی تو اگر کہیں پورا قرآن مجید یا اس کا بیشتر حصہ یک بارگی نازل ہو جاتا تو کیا ہوتا، ظاہر ہے کہ ہمارا یہ اندازہ بھی بہت ہی ناکمل اور سطحی نوعیت کا ہے۔ اس طرح کا اندازہ بھی ہم صرف ایک حد تک ہی کر سکتے ہیں، عین ممکن ہے کہ ہمارا یہ اندازہ بھی ناکمل ہی ہو۔

اس ضمن میں صرف دو واقعات کی طرف اشارہ کرنا کافی ہوگا۔ یہ واقعات جو مختلف صحابہؓ نے بیان کئے ہیں ان میں نزول وحی کے تجربہ کا محض ظاہری اور جسمانی پہلو بیان کیا گیا ہے، اس لیے کہ یہی پہلو صحابہ کرامؓ کے مشاہدے اور تجربے میں آ سکتا تھا، ان دونوں واقعات کو بیان کرنے سے قبل ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی اس مشہور روایت پر بھی نظر ڈال لینا مفید ہوگا جس سے امام بخاری نے اپنی کتاب کا گویا آغاز کیا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ صحیح بخاری قرآن مجید کے بعد مسلمانوں کے نزدیک سب سے مستند کتاب ہے۔ مسلمان اس کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ مانتے ہیں۔ اس کتاب کا پہلا باب ہی اس بحث سے شروع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے باب کیف کان بدء الوحی علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعنی باب اس امر کے بیان میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر وحی کا آغاز کیسے ہوا؟ یہیں سے صحیح بخاری شروع ہوتی ہے۔ اس باب میں جو تفصیلی روایت ہے وہ حضرت عائشہ صدیقہؓ کی ہے۔ اس میں

حضرت عائشہ صدیقہؓ بیان فرماتی ہیں کہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی نازل ہوتی تھی تو وہ لمحہ اتنا مشکل اور اتنا سخت ہوتا تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر کوئی بڑی ہی غیر معمولی کیفیت طاری ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ مدینہ منورہ کی سرد راتوں میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی، اور سب جانتے ہیں کہ مدینہ منورہ کی راتیں کافی سرد ہوتی ہیں اور اس زمانے میں ہیٹنگ کا کوئی نظام مدینے میں نہیں تھا۔ نہ وہاں گھریلو حمام عام تھے اور نہ کسی قسم کے ہیٹر وہاں ہوتے تھے بلکہ سرے سے مدینہ منورہ میں مکان گرم کر کے رکھنے کا رواج ہی نہیں تھا۔ ان سرد اور یخ راتوں کے بارے میں حضرت عائشہ صدیقہؓ بیان کرتی ہیں کہ میں نے بارہا دیکھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی نازل ہوئی اور پیشانی مبارک سے پسینہ ایسے بہنے لگا جیسے کوئی فصد کھول دی گئی ہو اور اس سے خون بہتا ہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جو تجربہ تھا وہ جسمانی طور پر بھی اتنا تھکا دینے والا اور اتنا غیر معمولی ہوتا تھا کہ باہر دیکھنے والوں تک کو اندازہ ہو جاتا تھا کہ کیا کیفیت گزر رہی ہے۔

جن دو واقعات کا یہاں تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے ان میں سے ایک تو اس دن کا واقعہ ہے جس دن مکہ مکرمہ فتح ہوا۔ اس دن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اپنی اونٹنی پر سوار (انجیل کی زبان میں) دس ہزار قدسیوں کے جلو میں مکہ شہر میں داخل ہو رہے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وہ اونٹنی قصواء عرب میں بہت ہی طاقتور اونٹنی مانی جاتی تھی، جب بھی کوئی مقابلہ ہوتا تو وہ دوڑ میں سب سے آگے نکلتی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسے خاص اہتمام کے ساتھ ہجرت کے سفر کے لیے خریدا تھا اور کئی مہینے میں اس کو خاص خوراک کھلا پلا کر تیار کیا تھا۔ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی اسی تاریخی اونٹنی قصواء پر سوار تھے، اور فاتحانہ مکہ مکرمہ میں داخل ہو رہے

تھے۔ ایک اونٹ جتنا بوجھ اٹھا سکتا ہے اور جو اس کی قوت برداشت ہوتی ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ مکہ شہر چاروں طرف پہاڑوں میں گھرا ہوا تھا اور آج بھی گھرا ہوا ہے۔ مکہ میں فوجوں کے داخلے کے لیے حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے صحابہ کرامؓ کے چار پانچ دستے بنا دیے تھے اور ہر دستے کو ہدایت تھی کہ مختلف راستے سے شہر میں داخل ہو۔ ایک راستہ وہ تھا جس سے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے دستے نے قلب شہر کو داخل ہونا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت تھی جو پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے آگے اپنی اونٹنی پر سوار تشریف لے جا رہے تھے۔ اچانک لوگوں نے دیکھا کہ وہ اونٹنی رک گئی اور یک بہ یک کھڑی ہو گئی۔ پورا لشکر جو پیچھے آ رہا تھا وہ بھی رک گیا۔ لوگ خیر خبر معلوم کرنے کے لیے بڑھ کر آگے آئے تو دیکھا کہ اونٹنی کے پاؤں لرز رہے ہیں اور اس سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا۔ ادب سے اوپر نظریں اٹھا کر دیکھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ کیفیت طاری تھی جو نزول وحی کے وقت ہوا کرتی تھی۔ پھر لوگوں نے دیکھا کہ اونٹنی کی ٹانگیں ایسی محسوس ہو رہی ہیں جیسے کسی کمزور سی چیز پر یک بہ یک بہت سارا بوجھ لاد دیا گیا ہو اور وہ ٹوٹنے لگے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی اونٹنی کی ٹانگیں ٹوٹ جائیں گی۔ اس ساری کیفیت کو اونٹنی برداشت نہیں کر سکی اور بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بیٹھنے کے کوئی ایک آدھ منٹ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ کیفیت بھی ختم ہو گئی، اونٹنی بھی پہلے کی طرح کھڑی ہو گئی اور چلنے لگی۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے جو صحابہ کرامؓ قریب تھے ان سے ارشاد فرمایا کہ یہ آیت نازل ہوئی ہے

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا (۸۱)

اور آپ کہہ دیجئے کہ حق آگیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل تو
مٹنے ہی والا تھا۔

کہنے کو یہ دو جملوں کی چھوٹی سی آیت ہے لیکن اس موقع پر کیفیت دیکھنے والوں نے جو کیفیت دیکھی وہ بیان کی جا سکتی۔ لیکن خود حضور علیہ الصلوۃ والسلام پر کیا گزری وہ ظاہر ہے کہ نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا اور نہ اس کا کسی کو کوئی اندازہ ہو سکتا ہے۔

دوسرا واقعہ خود ایک صحابی کا ہے جن پر قرآن سے نزول کی کیفیت گزری ہے اور انہوں نے اپنی گزری خود بیان کی ہے۔ ان کے بیان سے مزید اندازہ ہوتا ہے کہ نزول وحی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا گزرتی ہوگی۔ یہ واقعہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا ہے جو مشہور صحابی ہیں اور حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے کاتب وحی رہے ہیں۔ حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی تحریر اور کتابت حضرت زید بن ثابت ہی کیا کرتے تھے۔ کاتبان وحی میں بھی سب سے نمایاں درجہ انہی کا ہے۔ یہ واقعہ ہجرت کے دو ایک سال بعد کا ہے۔ ان دنوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنا مشہور اور تاریخ ساز مشورہ جہاد مدینہ سے باہر فرما رہے تھے۔ ان صحبتوں میں مختلف قبائل کے سرداروں سے گفت و شنید کا سلسلہ جاری تھا۔ حضرت زید بن ثابتؓ بطور سیکرٹری ہر نشست میں حاضر رہتے تھے۔ انہوں نے بیان کیا کہ ایک مرتبہ ہم لوگ ایک مجلس میں جمع تھے جس میں سب لوگ چار زانو ہو کر قریب قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ تنگ جگہ کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھٹنے کا کنارہ حضرت زید بن ثابتؓ کے گھٹنے پر آیا ہوا تھا (عام طور پر قریب قریب بیٹھنے میں تو ایسا ہو جاتا ہے) حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ یکایک مجھے ایسا لگا کہ جیسے میرے گھٹنے پر کسی نے پہاڑ

اٹھ کر رکھ دیا ہو۔ اس پر انہوں نے چونک کر دیکھا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ کیفیت تھی جو وحی کے نزول کے وقت ہوا کرتی تھی۔ حضرت زید کہتے ہیں کہ ایک دم سے میرے گھٹنے پر اتنا بوجھ آ گیا کہ مجھے ایسا لگا کہ میرا گھٹنا چور چور ہو کر ہڈی ریزہ ریزہ ہو جائے گی۔ میں نے اپنا گھٹنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے گھٹنے کے نیچے سے نکالنا چاہا تو بوجھ کی وجہ سے نکال نہ سکا۔ مگر بس ایک ہی لمحے میں یہ کیفیت ختم ہوگئی اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ قرآن پاک میں سورۃ نساء کی آیت لَا يَسْتَوِي

الْقَاعِدُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ غَيْرُ أُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ (۲۱)

ان دو مثالوں سے واضح طور پر یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ نزول قرآن پاک کا عمل ظاہری اعتبار سے بھی کتنا بھاری اور کتنا ثقیل ہوتا تھا۔ اس ثقل اور شدت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ قرآن پاک کو یک بارگی نازل کرنے کے بجائے تھما تھما یعنی تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا جائے۔

بعض حضرات نے اس باب میں تامل کیا ہے کہ تورات، انجیل اور دوسری آسمانی کتابیں یک بارگی نازل کی گئی تھیں۔ انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ جس طرح قرآن مجید تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا گیا اسی طرح تورات اور انجیل بھی تھوڑی تھوڑی کر کے ہی نازل کی گئیں۔ لیکن قرآن مجید کی متعلقہ آیات پر سرسری طور پر غور کرنے سے ہی اس رائے کی کمزوری ظاہر ہو جاتی ہے۔ سورۃ الاعراف میں جہاں نزول تورات کا ذکر ہے وہاں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ تورات ایک دو نہیں بلکہ بہت سی تختیوں پر لکھی ہوئی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئی تھی (۲۲)۔ ہدایت و رحمت پر مبنی یہ نسخہ کیمیا ان تختیوں پر لکھا ہوا تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام طور سینا سے

نزول وحفاظتِ قرآن

نزولِ قرآن کے حوالے سے حضرت زیدؓ بن ثابت کا تجربہ اوپر گزرا ہے۔
واقعہ یہ تھا کہ ہجرت کے دو ایک سال بعد قرآن پاک کی ایک آیت نازل ہوئی جس میں کہا گیا تھا کہ جو لوگ جہاد میں حصہ لینے کے لیے گھروں سے نکلنے کے بجائے پیچھے بیٹھے رہتے ہیں ان کا درجہ اور جہاد میں نکلنے والوں کا درجہ برابر نہیں ہے، بلکہ مجاہدین کا درجہ بہت بڑا ہے۔ مجاہدینِ اسلام کی اس فضیلت کے بیان کرنے کے لیے یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرامؓ میں جہاد کا غیر معمولی اشتیاق پیدا ہوا اور بار بار جہاد کے لیے جانے لگے۔ اس پر ایک مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن ام مکتومؓ نے جو نابینا تھے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تو اللہ کے راستے میں نکلنا چاہتا ہوں لیکن اپنی جسمانی مجبوری کی وجہ سے کچھ نہیں کر سکتا، اگر بالفرض نکلوں بھی تو کس کام کا؟ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اس فضیلت میں کبھی بھی شریک نہیں ہو سکتا؟ اس میں میرا کیا قصور ہے؟ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر کچھ توقف فرمایا اور غالباً آپ کچھ سوچ ہی رہے تھے کہ اس کا کیا جواب دیں، کہ فوراً ہی یہ ٹکڑا نازل ہوا غیر اولی الضرر یعنی ان لوگوں کے علاوہ جو کسی عذر یا شکایت کی

بنا پڑے جائیں، یعنی وہ لوگ جو بغیر کسی عذر یا تکلیف کے پیچھے بیٹھے رہیں ان کے درجات تو کم ہوں گے، لیکن جو لوگ معذور ہیں، نابینا ہیں، محتاج ہیں، یا اپاہج ہیں، یا کچھ اور اسی طرح کا عذر ہے تو ان کے ساتھ یہ بات نہیں ہے بلکہ ان کا درجہ وہی ہوگا جو جہاد کرنے والوں کا ہے۔ اس پر حضرت عبداللہؓ بن ام مکتومؓ کو تسلی ہوگئی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک قانون بن گیا کہ جس کو کوئی ایسا عذر ہو کہ وہ جہاد میں شریک نہ ہو سکے وہ جہاد میں شرکت سے مستثنیٰ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس موقع پر بھی ایک ٹکڑا نازل ہوا اور وہ تھا غیر اولی الضرر

ان مثالوں کو سامنے رکھ کر ہم کہہ سکتے ہیں کہ قرآن پاک کا تھوڑا تھوڑا نازل کیا جانا بھی، جیسا کہ ہم ابھی دیکھیں گے، خود اپنی جگہ اس کے وحی الٰہی ہونے کا ایک ثبوت ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کتاب، اللہ کی کتاب ہے اور اسے ایک بڑی مصلحت کے تحت، ایک بڑی (Divine Scheme)، ایک الٰہی منصوبے کے نتیجے میں نازل کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں جب ہم نزولِ قرآن کے آغاز، نزولِ قرآن کے عمل اور انداز نزول پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں واضح طور پر یہ پتہ چل جاتا ہے کہ قرآن پاک کا تھوڑا تھوڑا نازل کیا جانا کس اعتبار سے اس کی حقانیت کی دلیل ہے؟

یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ قرآن پاک کا نزول ایک بار کی نہیں بلکہ تئیس سال کی طویل مدت کے دوران ہوا۔ لیکن ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں آتا ہے کہ ہم نے اس کو لیلۃ القدر میں نازل کیا۔ کئی لوگ یہ سوال پوچھتے ہیں کہ اگر قرآن پاک لیلۃ القدر میں نازل ہوا تو پھر تئیس سال کے طویل عرصے میں کیا چیز نازل ہوتی رہی، اور اگر ۲۳ سال میں قرآن مجید نازل ہوا لیلۃ القدر میں پھر کیا نازل کیا گیا۔ اس کا جواب بہت آسان ہے اور خود قرآن مجید کے الفاظ سے ہی معلوم ہوجاتا ہے۔ قرآن

مجید میں اتارے جانے کے لیے دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ ایک ہے "انزال" اور دوسرا ہے "تنزیل"۔ انزال کے معنی ہیں، اتار دینا۔ آپ کسی کو موٹر میں سوار کرا کے کہیں لے گئے اور آپ نے کہا نزلتہ فی المکان الفلانی میں نے اس کو فلاں جگہ اتار دیا۔ یعنی انزال کے معنی ہوئے یکمشت دینا۔ کسی چیز کو پورے کا پورا ایک ہی وقت میں اتار دیا جائے۔ اس کو انزال کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ آپ نے کسی کو مکان کی دوسری منزل سے اتارا۔ اب چھت پر سے اتار دیا، کھڑکی سے گرا دیا، یا رسی سے لٹکا کر اتار دیا۔ ان سب صورتوں میں انزال استعمال ہوگا اور اس کے استعمال سے مفہوم ادا ہو جائے گا۔

لیکن عربی زبان میں ایک دوسرا صیغہ نزل (مصدر تنزیل) مستعمل ہوا ہے جس کے معنی ہیں تھوڑا تھوڑا کر کے کسی چیز کو اتارنا۔ آپ بہت سی اینٹیں چھت پر سے نیچے لے جائیں اور ایک ایک کر کے اتارتے چلے جائیں تو اس کو آپ کہیں گے نزلت اللبن میں نے ایک ایک کر کے اینٹیں اتار دیں۔

قرآن مجید میں جہاں کہیں لیلۃ القدر کا ذکر ہے وہاں انزال (مصدر انزال) کا صیغہ استعمال کیا گیا ہے۔ جیسے

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ (۳۳)

بے شک ہم نے اس کو شب قدر میں نازل کیا ہے۔

إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ إِنَّا كُنَّا مُنذِرِينَ (۲۵)

یقیناً ہم نے اس کو ایک بابرکت رات میں اتارا ہے۔

اس کے برعکس جہاں جہاں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر تھوڑا تھوڑا کر کے اتارے جانے کا ذکر ہے، وہاں نزل (مصدر تنزیل) کا صیغہ آیا ہے جیسے

نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ (۲۶)

اس کو روح الامین لے کر اترا۔

نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ (۲۷)

یہ اس لیے کہ اللہ نے حق کے ساتھ کتاب اتاری تھی۔

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۙ (۲۸)

بہت بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فیصلے کی کتاب نازل کی، تاکہ وہ تمام اہل جہاں کو خبردار کرنے والا بن جائے۔

قُلْ نَزَّلَهٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ (۲۹)

آپ کہہ دیجیے کہ اس کو تو روح القدس نے آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل کیا ہے۔

وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۙ (۳۰)

اور ہم قرآن میں ایسی چیزیں نازل کرتے ہیں جو ایمان والوں کے لیے شفا اور رحمت ہیں۔

وغیرہ۔ تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تنزیل اور انزال دو الگ الگ اصطلاحیں ہیں جن میں قرآن پاک میں فرق کیا گیا ہے۔ لیلۃ القدر میں جو ہوا وہ تنزیل نہیں بلکہ انزال تھا، یعنی یک بارگی پورا قرآن پاک لوح محفوظ سے آسمان دنیا پر اتارا گیا اور پھر وہاں سے آگے تھوڑا تھوڑا جبرئیل امین کے ذریعے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا جاتا رہا، یہ تنزیل ہے اور یہ ۲۳ سال کے عرصے میں مکمل ہوئی۔

قرآن پاک جن لوگوں نے بھی پڑھا ہے ان میں سے ہر شخص اس بات کو

جاننا ہے کہ جس ترتیب سے یہ نازل ہوا اس ترتیب سے یہ آج لکھا ہوا نہیں ہے۔ ترتیب کے لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو سورۃ العلق ۹۶ نمبر سورت کی پہلی پانچ آیتیں سب سے پہلے نازل ہوئیں، اور جو سورت ہجرت کے دو سال بعد نازل ہوئی۔ یعنی سورۃ البقرہ، وہ سب سے شروع میں ہے۔ تو گویا جس ترتیب سے قرآن مجید نازل کیا گیا تھا اس ترتیب سے اس کو مرتب نہیں کیا گیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ترتیب کے اس اختلاف میں کیا مصلحت ہے۔ کیا یہ ترتیب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قائم کردہ ہے؟ اگر یہ ترتیب خود سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تو اس میں کیا مصلحت تھی؟ کیا ہمارے لیے اس کی حکمت کو سمجھنا ممکن ہے؟ مفسرین نے اس پر بڑی بحثیں کی ہیں، اس کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ میری ناچیز رائے میں قرآن پاک کی نزولی ترتیب اور موجودہ ترتیب کے درمیان جو فرق ہے وہ بھی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ یہ میں ابھی آگے چل کر عرض کرتا ہوں کہ کیسے؟ لیکن سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ قرآن پاک کا نزول شروع کیسے ہوا اور پہلی وحی کے واقعات کیسے وجود میں آئے؟

حضرت عائشہ صدیقہؓ کی وہ روایت جس کے بارہ میں عرض کیا جا چکا ہے کہ صحیح بخاری کے شروع میں بڑی طویل روایت ہے اس میں حضرت عائشہ صدیقہؓ یہ بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک ۴۰ سال کے قریب پہنچ گئی تھی ۳۸۔۳۹ سال کے قریب ہوئی تو حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خود بخود تنہائی کا ایک شوق پیدا ہوگیا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دنیا سے الگ تھلگ رہنے کا جذبہ بڑھتا چلا گیا۔ دنیوی سرگرمیاں اور مشاغل کم سے کم ہوتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مکہ مکرمہ سے تین ساڑھے تین میل کے

دوبارہ یہیں تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ان جاتے وقت کھانے پینے اور ضروریات کا
مزید سامان بھی لے جاتے تھے۔

اسی طرح کوئی سال گزر گئے تھے کہ ہر سال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریقہ
رہا۔ جب عمر مبارک ۳۹ سال کے لگ بھگ ہوئی تو ایک نئی چیز حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام
نے محسوس کی اور وہ یہ تھی کہ رات کو سوتے ہوئے خواب دیکھتے تھے اور صبح کو وہ کام اسی
طرح ہو جاتا ہے جس طرح خواب میں دیکھا تھا۔ یہ ایک نیا تجربہ تھا جو حضور علیہ
الصلوٰۃ والسلام کو ہونے لگا۔ یہ کیفیت بھی کوئی سال بھر جاری رہی۔ سال بھر کے بعد
مزید ایک نئی بات حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے محسوس کی، اور وہ یہ کہ جب گھر
سے نکلتے کسی ضرورت سے نیچے اترتے تو مختلف پہاڑوں سے آواز آتی ہے "محمد" اِدھر
اُدھر دیکھتے ہیں تو کوئی نظر نہیں آتا۔ پھر تشریف لے جاتے ہیں پھر آواز آتی ہے السلام
علیکم، لیکن کوئی نظر نہیں آتا۔ یہ محسوس ہوتا ہے جیسے پہاڑوں کی طرف سے آواز آرہی ہے۔
کبھی محسوس ہوتا ہے کہ درخت میں سے آواز آرہی ہے۔ یہ کیفیت بھی کچھ مدت تک
آٹھ دس مہینے جاری رہی۔

جب عمر مبارک ۴۰ سال تک پہنچ گئی اور رمضان المبارک کا مہینہ آیا اور
رمضان کی ۱۷ ویں شب تھی۔ پیر کا وقت تھا غالباً ڈھائی بجے کا عمل رہا ہوگا، حضور
معتکف تھے، رات تاریک تھی۔ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اچانک محسوس کیا کہ
غار میں یک دم ایک روشنی ہوئی اور ایک فرشتہ غار میں داخل ہوا۔ اب
جو بخاری کی مشہور روایت ہے اس میں تو صرف اتنا ذکر ہوا ہے کہ داخل ہونے والے
نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہا کہ پڑھو اقرأ، آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا
ما انا بقاری میں تو پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ یعنی حیرت کی کیفیت ہے آپ ہے جس کا وجہ

مفسرین اور محدثین کے نزدیک زیادہ اونچا نہیں۔ اس میں یہ لکھا ہے کہ جو آنے والے صاحب تھے انہوں نے ایک تحریر ریشمی کپڑے پر کڑھی ہوئی پیش کی اور اس کو سامنے کر کے کہا کہ پڑھو! تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا ما انا بقاری یہ روایت غلط نہیں معلوم ہوتی۔ ممکن ہے ایسا ہوا ہو، اس لیے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو جواب عطا فرمایا اس سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ کوئی تحریر بھی پیش کی گئی ہوگی۔ اس لیے کہ اگر بغیر کسی تحریر کے یہ کہا جائے کہ پڑھو تو پوچھنے والا یہ پوچھے گا کہ کیا پڑھوں؟ لیکن اگر کوئی تحریر مثلاً میرے سامنے جرمن میں لکھی ہوئی پیش کی جائے یا کسی کے سامنے یونانی زبان کی تحریر پیش کر کے اس سے پڑھنے کو کہا جائے تو جواب یہ ہوگا کہ میں تو یہ پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید وہ روایت صحیح ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کوئی تحریر تھی ریشم پر کڑھی ہوئی جو پیش کی گئی تھی۔ بہر حال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جواباً ارشاد فرمایا ما انا بقاری وہ صاحب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے بغل گیر ہوئے اور بہت زور سے دبایا یہاں تک کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے تھے کہ میرے بس سے باہر ہوگیا۔ پھر چھوڑ دیا اور کہا کہ اقراء پڑھو۔ آپ نے پھر جواب ارشاد فرمایا ما انا بقاری میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ انہوں نے پھر دوسری بار بغل گیر ہو کر پہلے سے بھی زیادہ زور سے دبایا اور کہا پڑھو۔ سرکار صلی اللہ علیہ وسلم کا پھر وہی جواب تھا۔ پھر چوتھی مرتبہ کے بعد انہوں نے ساتھ ساتھ پڑھنا شروع کیا:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ
اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ
مَا لَمْ یَعْلَمْ (۳۱)

پڑھو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو
جمے ہوئے خون سے پیدا کیا، پڑھو اور تمہارا رب تو بہت کریم ہے،
جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا، انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ
نہیں جانتا تھا۔

وہ صاحب ایک ایک جملہ پڑھتے گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ساتھ ساتھ پڑھتے چلے گئے۔ یہ واقعہ رونما ہونے کے بعد وہ صاحب غائب ہو گئے، اس کیفیت کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اتنا غیر معمولی اثر ہوا کہ جسم مبارک لرزنے لگا اور یہ خیال ہوا کہ پتہ نہیں یہ کیا چیز ہے؟ کیا تجربہ ہے؟ اور کیا میری زندگی کا آخری وقت آ گیا ہے؟ اب کیا ہوگا؟ اسی پریشانی میں آپ اسی وقت واپس گھر تشریف لے گئے۔ یہ واقعہ یقیناً صبح صادق سے قبل کا وقت ہوگا جب آپ گھر پہنچے ہوں گے۔ وہ وقت عام معمول کے لحاظ سے واپس گھر تشریف لانے کا نہیں تھا۔ یقیناً گھر والے پریشان ہوئے ہوں گے، انہوں نے دیکھا کہ آپ کے بدن مبارک پر لرزہ طاری ہے اور آپ ﷺ سخت پریشانی کے عالم میں ہیں۔ گھر آتے ہی آپ نے کپڑے وغیرہ مانگے اور اوڑھ کے تھوڑی دیر لیٹ گئے۔ کچھ دیر لیٹنے کے بعد جب ذرا سکون ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سارا واقعہ حضرت خدیجہؓ سے بیان کیا اور پھر آپ نے فرمایا

لقد خشیت علی نفسی

یہ بخاری کی اسی روایت میں ہے، یعنی مجھے اپنی جان کا ڈر ہے کہ میں ہلاک نہ ہو جاؤں۔ اس موقع پر حضرت خدیجہؓ نے جو بے ساختہ تسلی دی وہ تسلی بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی برحق ہونے کی ایک اہم اور دلچسپ دلیل ہے۔ حضرت خدیجہؓ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کہا ہرگز نہیں، عربی کے الفاظ ہیں:

كلا واللّٰه لا يخزيك اللّٰه ابدا، انك لتصل الرحم، وتحمل الكل، وتقري الضيف، وتعين علىٰ نوائب الحق (۳۴)

ہرگز نہیں! اللہ کبھی بھی آپ کو رسوا نہیں کرے گا، کبھی شرمندہ نہیں کرے گا، اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم صلہ رحمی کرتے ہیں، لوگوں کا بوجھ بانٹ لیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں اور حق کے معاملے میں لوگوں کی مدد کے لیے حاضر رہتے ہیں۔

تنہا ایسا آدمی کیسے رسوا ہوسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ کیسے ایسے آدمی کو رسوا کرسکتا ہے جو اتنے بلند اخلاقی مرتبے پر فائز ہو، آپ جیسا عالی مقام انسان کسی مابعد الطبیعی ناگہانی آفت کا شکار ہو! ایسا نہیں ہوسکتا۔

جس وقت یہ واقعہ ہوا اور حضرت خدیجہؓ نے یہ بات کہی وہ کوئی چھوٹی عمر کی بچی نہیں تھیں۔ اس واقعے کے وقت ان کی عمر کوئی ۵۴، ۵۵ سال تھی اور مکہ مکرمہ کی ایک بڑی عاقل سمجھ دار اور ذمے دار خاتون تھیں۔ اتنی سمجھ دار تھیں کہ ان کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار تھا، ان کے تجارتی قافلے شام اور یمن وغیرہ جایا کرتے تھے اور ان کے ملازمین کی ایک بڑی تعداد تھی جو یہ سارا کام کیا کرتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے اجنبی نہیں تھے، پندرہ سال سے تو ان کے شوہر اور دن رات کے رفیق تھے۔ شادی سے کئی سال قبل سے کاروباری رفاقت بھی تھی۔ اس وقت سے ہی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اخلاق و کردار اور دیانت داری کے گہرے نقوش ان کے دل و دماغ پر ثبت تھے اور اسی کردار سے متاثر ہو کر ہی انہوں نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں آنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ پھر اس رفاقت سے بھی پہلے ۲۵ سال سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اسی بستی کے رہنے والے تھے۔ دور کے عزیز بھی ہوتے

تھے۔ حضورؐ حضرت خدیجہؓ کے لیے کوئی ایسے اجنبی نہ تھے کہ وہ پہلے سے واقف نہ ہوں۔

خلاصہ یہ کہ حضرت خدیجہؓ چالیس سال سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو جانتی تھیں، چالیس سال کے اس تجربے کے بعد جب یہ واقعہ رونما ہوا تو ان کا بے ساختہ رد عمل یہ تھا کہ ایسا عظیم انسان جو اتنے اونچے کردار اور بلند اخلاق کا مالک ہے اس کو اللہ تعالیٰ رسوا کر ہی نہیں سکتا۔ حضرت خدیجہؓ کا یہ فوری ردعمل حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کی حقانیت کی روشن دلیلوں میں سے ایک ہے۔ اگر آپ ﷺ کے کردار میں ذرہ بھر بھی کوئی اور پہلو ہوتا تو وہ اس پچیس سالہ رفاقت کے دوران حضرت خدیجہؓ جیسی پختہ عمر اور ذہین خاتون سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تھا۔ انسان گھر سے باہر جتنا بھی عظیم مانا جائے اپنے گھر والوں کی نظر میں وہ وہی رہتا ہے جو وہ حقیقت میں ہوتا ہے۔ دور کے ڈھول تو ہر ایک سہانے بنا سکتا ہے لیکن شب و روز کی رازدار و ہم دم سے اپنی کمزوریاں چھپا کر رکھنا کسی انسان کے بس میں نہیں ہوتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ تاریخ کے اکثر مشاہیر کی بیویاں دنیا بھر کے برعکس اپنے شوہروں کی عظمت کی زیادہ قائل نہیں ہوتیں۔

بہرحال اس پہلی وحی کے کچھ ہی عرصے بعد دوسری اور پھر تیسری وحی نازل ہوئی اور پھر یہ سلسلہ ایک مسلسل بارش کی طرح شروع ہو گیا۔ ان ابتدائی آیات ہی میں جو دوسری یا تیسری وحی میں شامل تھیں ایک آیت نازل ہوئی جس میں فرمایا گیا:

إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا (۳۳)

ایک ثقیل کلام آپ پر ہم نازل کریں گے۔

پھر ایک ایک کر کے جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے جیسے جیسے حالات پیش

آتے گئے ان کے حساب سے وحی نازل ہوتی گئی، ہر ہر قدم پہ اور ہر ہر لمحے! حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تسلی کے لیے صحابہ کرامؓ کی راہ نمائی کے لیے، نئی نئی ہدایات نازل ہوتی گئیں۔ کفار مکہ کے نت نئے اعتراضات کے جواب دیے گئے، یہودیوں کے شبہات کو دور کیا گیا، عیسائیوں کے شکوک کا دفعیہ کیا گیا۔ غرض جو جو مشکلات ان ۲۳ سالوں میں آتی گئیں ان سب کا حل قرآن پاک میں نازل ہوتا گیا۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے ہی دن سے یہ طریقہ بھی اختیار فرمالیا تھا کہ قرآن پاک کا جو حصہ نازل ہوا اس کو فوراً ضبط تحریر میں لانے کا بندوبست کرادیں اور صحابہ کرامؓ کو یاد بھی کرادیں۔ قرآن پاک میں آیا ہے کہ جو حصہ نازل ہوتا تھا وہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلب مبارک پر گویا آپ سے آپ لکھا جاتا تھا، پھر اس کے مٹنے کا یا بھولے جانے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ شروع شروع میں یہ ہوا کہ جب فرشتہ آتا یا وحی کی مخصوص آواز آتی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود بھی جلدی جلدی پڑھنا شروع کردیتے تھے۔ اس پر ایک جگہ کہا گیا کہ ایسا نہ کرو بلکہ خاموشی سے سنو اور مطمئن رہو تم بھولو گے نہیں:

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهِ إِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهُ وَقُرْآنَهُ (۳۴)

آپ اس (قرآن) کو جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں، کیوں کہ اس کا جمع کرنا اور اس کا پڑھوانا ہمارے ذمے ہے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا گیا:

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ (۳۵)

ہم خود تمہیں پڑھوا دیں گے، پھر تم بھولو گے نہیں۔

گویا جوں ہی وہ نازل ہوتا تھا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دل پر لکھا جاتا تھا اور اس کے مٹنے یا بھولنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اسی وقت یا اگر رات کو وحی آتی تو اگلے دن اسے صحابہ کرامؓ کو زبانی یاد کروا دیا کرتے تھے۔ صحابہ میں سے جو موجود ہوتے وہ اسی وقت زبانی یاد کرلیا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ پہلے ہی دن سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بندوبست بھی کیا کہ جو صحابہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان کو روز کے روز نیا نازل شدہ حصہ لکھوا دیا جاتا تھا۔

اس وقت مکہ مکرمہ میں کاغذ کا زیادہ رواج نہیں تھا، کاغذ ملتو جاتا تھا لیکن بڑا مہنگا اور کم یاب تھا، چین میں بنتا تھا اور چین ہی سے آتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں چین سے کتنا کاغذ آسکتا تھا؟ آپ اس کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ لیکن لکھنے کے لیے عام طور پر جو سامان استعمال ہوتا تھا وہ یا تو لکڑی اور پتھر کی تختیاں ہوتی تھیں یا ایک کاغذ نما جھلی بنتی تھی جو کسی جانور عموماً اونٹ یا ہرن کی جھلی سے تیار ہوتی تھی۔ زیادہ رواج اس جھلی کا تھا اس کی کتابیں آج بھی موجود ہیں اور آج بھی دنیا کی کئی لائبریریوں میں اس جھلی پر لکھا ہوا پورا کتب خانہ موجود ہے۔ دیکھنے سے اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ قدیم انداز کا کاغذ ہے یا Parchment ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو تبلیغی خطوط بعد میں مختلف بادشاہوں کو تحریر فرمائے وہ بھی اسی جھلی یعنی Parchment پر تحریر فرمائے گئے۔ جھلی کے علاوہ جانوروں کی ہڈی کی تختیاں بھی اس غرض کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ اونٹ چونکہ بڑا جانور ہے اس کے کندھے کی ہڈی بہت بڑی ہوتی تھی، اس لیے اس سے بھی تختی بنتی تھی۔ غرض یہ سب چیزیں عرب میں مروج تھیں اور ان سب چیزوں پر قرآن پاک بھی لکھا جاتا تھا۔ نزولِ وحی کے عمل کی تکمیل کے بعد جو لکھنے

والا بھی دست یاب اور قریب ہوتا تھا اس کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بلا بھیجتے اور بلا کر جو چیز لکھنے کی اس وقت فوری طور پر دست یاب ہوتی تھی اس پر لکھوا دیا کرتے تھے، اور زبانی یاد کرنے والوں کو ترتیب بھی اسی وقت بتا دیا کرتے تھے کہ اس کو فلاں آیت سے یا سورت سے پہلے یاد کر لینا اور اس کو فلاں آیت یا سورت کے بعد یاد کر لینا۔

پھر جب مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کی تعداد بڑھتی چلی گئی تو حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام نے مسلمانوں بالخصوص خواتین کی تعلیم قرآن کا بندوبست بھی فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے موبائل ٹیچرز مقرر فرمائے کہ وہ گھر گھر جا کر خواتین کو قرآن پاک کے تحریری اجزا بھی فراہم کریں اور قرآن کی تعلیم بھی دیں۔ ہم میں سے اکثر نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبول اسلام کا واقعہ سنا ہے۔ وہ جب اپنی بہن اور بہنوئی کو قتل کرنے کی نیت سے اپنی بہن کے گھر پہنچے تو وہاں انہوں نے دیکھا کہ قرآن پاک پڑھنے کی آواز آرہی ہے اور ایک صحابی خباب بن ارت رضی اللہ عنہ قرآن پڑھا رہے ہیں۔ اس وقت ان کی بہن کے پاس سورۃ طٰہٰ لکھی ہوئی موجود تھی، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس وقت بھی جب کہ ظلم و ستم اپنی انتہا پر تھا اور کفار مکہ کی طرف سے قتل و غارت اور تشدد کی ہر صورت روا رکھی جارہی تھی اس وقت بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اہتمام کیا کہ گروشی معلم مقرر کئے، اور قرآنی نوشتے گھر گھر فراہم کئے۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ گویا ایسے ہی ایک موبائل معلم تھے جو گھروں میں جا کر چپکے چپکے خاموشی سے لوگوں کو قرآن پڑھایا کرتے اور نہ صرف قرآن پڑھا کرتے بلکہ تازہ نازل شدہ حصہ ان کو لکھا ہوا لے جا کر فراہم بھی کیا کرتے تھے۔ چناں چہ آپ نے پڑھا ہوگا کہ ان کی بہن نے گھٹنے کے نیچے سے سورۃ طٰہٰ کا ایک حصہ لکھا ہوا نکالا، جس کو حضرت عمرؓ

سے پڑھا اور پڑھ کر مسلمان ہوئے۔ اس واقعے سے کتابت قرآن، حفظ قرآن، تدوین قرآن اور تفہیم قرآن اور بالخصوص تعلیم نسواں کی بہت سی تفصیلات ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ مدینہ منورہ میں نسبتاً زیادہ آزادی اور زیادہ بہتر ماحول موجود تھا، وہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حفاظت قرآن کے لیے ان دو اقدامات کے ساتھ ساتھ مزید دو کام اور شروع کر دیئے۔ قرآن پاک کا زبانی یاد کیا جانا پہلے سے رائج تھا، اب ایک نیا کام یہ شروع ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں باقاعدہ ایک بڑی درس گاہ قائم کر دی جو صفہ کے نام سے مشہور ہوئی، وہاں پڑھانے کے لیے ایسے صحابہ کرامؓ کو مقرر کر دیا جو اوروں کی نسبت قرآن پاک کی زیادہ تعلیم رکھتے تھے۔ جلد ہی مسجد نبوی کے ساتھ ساتھ مزید اور مسجدیں بھی مدینہ پاک کے مختلف محلوں میں قائم ہو گئیں اور ایسی بہت سی مسجدوں میں جن میں سے کم و بیش انتالیس مسجدوں کی صراحت موجود ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مختلف معلموں کو مقرر کیا جو وہاں لوگوں کو قرآن پاک پڑھایا کرتے تھے۔ گویا مدینہ منورہ آتے ہی تعلیم القرآن کے قریب قریب تین درجن سے زائد مدرسے شہر بھر میں قائم ہو گئے۔ ان سب کی راہ نمائی اور سرپرستی کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحابیؓ کو اسلامی تاریخ کا گویا پہلا ناظم تعلیمات (انسپکٹر آف ایجوکیشن) مقرر کر دیا، وہ روزانہ مسجدوں میں جا کر جائزہ لیتے کہ قرآن پاک صحیح پڑھایا جا رہا ہے اور صحیح تعلیم ہو رہی ہے۔ اس طرح قرآن پاک کی تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ سرکاری طور پر شروع ہو گیا۔ یہ تیسرا کام تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ میں شروع کیا۔

چوتھا کام یہ ہوا کہ ہر رمضان المبارک میں (رمضان المبارک خاص طور پر قرآن پاک اور وحی الٰہی سے رشتہ استوار کرنے کا مہینہ ہوتا ہے) جبرئیل امین خاص طور پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ترتیب سے سناتے تھے جس ترتیب میں آج ہمارے پاس موجود ہے۔ یہ اس بات کو مزید یقینی بنانے کے لیے تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یادداشت میں یا قلب مبارک میں قرآن صحیح طور سے محفوظ رہے۔ اس سماعت کے بعد پھر خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جبرئیل امین کو سنایا کرتے تھے اور گویا دونوں آپس میں دور کرتے تھے۔ حفاظ کرام میں جو دور کرنے کا رواج ہے وہ اسی مقدس واقعے کی یاد ہے کہ سنانے والا سناتا ہے اور دوسرا سنتا ہے، پھر دوسرا سناتا ہے اور پہلا سنتا ہے۔ یہ رواج اسی وقت سے صحابہ کرامؓ میں جاری ہوا اور آج تک الحمد للہ جاری ہے۔ چنانچہ ایک دور تو جبرئیل امین اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان ہوتا۔ پھر جن جن صحابہ کرامؓ کے پاس قرآن پاک کے لکھے ہوئے نسخے موجود تھے وہ مختلف ٹکڑے اور مختلف سورتیں لے آتے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سنا کر اپنی اپنی تحریروں کی اصلاح کر لیتے۔ چنانچہ صحابہ کرامؓ اپنی اپنی تختیاں، کاغذ یا جھلیاں لے آتے تھے اور پڑھ پڑھ کر سناتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سن کر فرما دیتے تھے کہ ہاں ٹھیک ہے اور جہاں کہیں غلطی ہوتی تو اس کی تصحیح فرما دیا کرتے تھے۔ اسی طرح جن لوگوں نے زبانی یاد کیا ہوتا تھا وہ زبانی سنایا کرتے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سن کر اس کی تصحیح کر دیا کرتے تھے۔ تو گویا یہ دو طرفی مشق (Two Way Exercise) ہوا کرتی تھی جو ہر رمضان المبارک میں کی جاتی تھی۔

یہ تھے قرآن پاک کی حفاظت کے لیے کیے جانے والے وہ اقدامات جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ میں اختیار فرمائے۔ یہ چاروں کام

حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کی حیات ارضی کے آخری لمحے تک ۲۳ سال تک جاری رہے۔ جب حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کی زندگی کا آخری رمضان المبارک آیا یعنی وصال سے چھ مہینے پہلے تو جبرئیل امین سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دور دو مرتبہ ہوا۔ دو مرتبہ جبرئیل امین نے سنایا، اور دو ہی مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو سنایا۔ گویا یہ بالواسطہ اشارہ اس بات کا تھا کہ یہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا آخری رمضان المبارک ہے، اور حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کی زندگی میں اب اگلا رمضان نہیں آنے گا۔ اس طرح جس لمحے قرآن پاک کے نزول کی تکمیل ہوئی تو اسی لمحے اس کی ترتیب بھی مکمل ہوگئی۔

قرآن کریم کی ترتیب

اب میں عرض کروں گا کہ اس طرح تکمیل کے عمل سے گزرنے والی یہ موجودہ ترتیب بھی اس بات کا ایک ثبوت ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر یہ کتاب اللہ کی طرف سے اتاری گئی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی حقانیت کی دلیل ہے۔ وہ دلیل کیا ہے؟ آپ دیکھیں کہ قرآن پاک ۲۳ سال کے عرصے میں تھوڑا تھوڑا نازل ہوا۔ محدثین اور ارباب سیر نے لکھا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر وحی کل ۲۴ ہزار مرتبہ نازل ہوئی۔ ان ۲۳ ہزار مرتبہ میں کبھی کتاب الٰہی کا ایک لفظ نازل ہوا، کبھی ایک جملہ، کبھی متعدد آیات، کبھی ایک پوری سورت اور کبھی سورت کا ایک حصہ۔ بعض اوقات ایک ہی آیت یا سورت ایک سے زائد بار بھی نازل ہوئی۔ جب بھی کوئی لفظ جملہ یا آیت نازل ہوتی فوراً ارشاد فرما دیا جاتا کہ اسے لکھ لو۔ اب یہ سب چیزیں بظاہر بغیر کسی ترتیب کے لکھی جا رہی ہیں۔ کہیں ادھر، کہیں ادھر، یعنی بغیر کسی تختے یا پلیٹ کے یہ چیزیں آ رہی ہیں اور لانے والا بتا رہا ہے کہ اس کو فلاں جگہ لکھو اور اس کو فلاں جگہ لکھو۔ تقریباً چوتھائی صدی کے طویل عرصے میں کہیں جا کر یہ ترتیب ہمارے سامنے آتی ہے جو آج ہمارے پاس موجود ہے۔ جب قرآن پاک کا نزول مکمل ہوا تو فوراً ہی اس کی یہ

ترتیب بھی مکمل ہوگئی اور قرآن پاک اس شکل میں ہمارے سامنے آگیا۔

اب آپ دیکھئے جو ترتیب بالآخر سامنے آئی ہے یہ کیا ہے؟ اس ترتیب پر بے شمار مفسرین قرآن اور محققین اسلام نے غور کیا ہے کہ اس ترتیب میں کیا کیا مصلحتیں اور کیا کیا حکمتیں پوشیدہ ہیں، یہ موضوع یوں تو بڑی تفصیل کا متقاضی ہے لیکن میں ایک چھوٹے سے پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہوں۔ ہمارے پاکستان ہی کے ایک بڑے نامور مفسر مولانا امین احسن اصلاحی رحمہ اللہ نے قرآن پاک میں ترتیب آیات اور ترتیب سورت کا ایک منفرد نظم دریافت کیا ہے۔ اس نظام کے مختلف پہلوؤں پر انہوں نے تفصیل سے لکھا ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ قرآن پاک کی جتنی سورتیں ہیں ساری کی ساری سات بڑے گروپوں میں تقسیم ہیں۔ سورتوں کے ہر گروپ میں جو بنیادی موضوع ہے وہ ایک ہی ہے اور اس گروپ کی ساری سورتوں میں مرکزی مضمون کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا نے سورتوں یا سورتوں کے گروپ میں پائے جانے والے مرکزی مضمون کو عمود (ستون) کی اصطلاح سے یاد کیا ہے۔ انہوں نے ہر گروپ اور ہر سورت کا الگ الگ عمود دریافت کیا ہے۔

پہلا گروپ سورۃ البقرہ سے شروع ہو کر سورۃ المائدہ تک چلتا ہے۔ اس کا بنیادی موضوع یعنی عمود نظام شریعت ہے۔ ان تمام سورتوں میں شریعت کے احکام اور فقہی امور نکاح، طلاق، وراثت، سے لے کر اسلامی نظام حکومت، اسلامی نظام قانون، حدود و تعزیرات اور قصاص و دیت وغیرہ یہ سارے مسائل عمومی انداز میں بیان ہوئے ہیں۔

دوسرا گروپ سورۃ الانعام سے شروع ہوتا ہے اور سورۂ توبہ پر ختم ہوتا ہے۔ اس کا موضوع ملت ابراہیمی کی تاریخ ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق چونکہ ملت

ابراہیمی سے ہے۔ اس لیے قرآن حکیم نے تفصیل سے بتایا کہ ملت ابراہیمی کو یہ امانت کیسے پہنچی اور کن مدارج سے ہو کر حضور علیہ الصلوۃ والسلام تک آئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ نبوت و رسالت کے خاتم ہیں اس لیے جس چیز کے خاتم ہیں اس سے پوری واقفیت ہونا ضروری ہے۔ یہ چیز بڑی اہم ہے اس لیے یہ سارے واقعات ان سورتوں میں بیان کیے گئے ہیں۔ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد کے واقعات اور یہ کہ ان تک کیسے یہ امانت پہنچی، کیسے ان کو امامت کا درجہ حاصل ہوا، بیت اللہ کی تشکیل کیسے ہوئی، اس کا سنگ بنیاد کیسے رکھا گیا؟ یہ سارے معاملات ان میں بیان ہوئے ہیں۔

پھر اس کے بعد کا تیسرا گروپ شروع ہوتا ہے جس میں نبوت کے خصائص اور ہجرت کے امتیازی مسائل بیان ہوئے ہیں۔ یہ گروپ سورۃ یونس سے شروع ہو کر سورۃ النور پر ختم ہوتا ہے۔ اس طرح ہر گروپ کا ایک الگ موضوع ہے۔ اس کے علاوہ دوسری بات جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ہر گروپ کسی مکی سورت سے شروع ہوتا ہے اور مدنی سورت پر ختم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ گروپ میں جتنی سورتیں ہیں وہ ساری کی ساری دو دو کے جوڑوں میں منقسم ہیں۔ گویا ہر سورت دوسری سورت کا ایک جوڑا یا زوج ہے۔ قرآن پاک میں کوئی سورت ایسی نہیں ہے جو تنہا ہو اور اس کا کوئی زوج نہ ہو۔ سوائے سورۃ الفاتحہ کے جو پورے قرآن پاک کا گویا افتتاحیہ ہے اور پورے کلام الٰہی کا ایک دیباچہ ہے۔ اس کے علاوہ جتنی سورتیں ہیں وہ سب دو دو سورتوں کے جوڑے کی شکل میں ہیں۔ بعض جگہ تو ذرا سا ہی غور کرنے سے سورتوں کے ان جوڑوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ مثلاً قرآن پاک کی آخری دو سورتیں قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس ایک جوڑا ہے اور قرآن سے ذرا سی واقفیت رکھنے والا ہر شخص جان سکتا

ہے کہ یہ دونوں سورتیں ایک دوسرے کا جوڑا ہیں۔

ایک جوڑے کی دو سورتیں کہیں تو ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں، بعض جگہ ایسا ہے کہ ایک ہی مضمون دو سورتوں میں بیان ہوا ہے۔ آدھا ایک سورت میں اور آدھا دوسری سورت میں۔ بعض جگہ ایسا نظر آتا ہے کہ ملتے جلتے مضامین دونوں سورتوں میں آگئے ہیں۔ بعض اوقات ایک چیز کا ایک پہلو ایک سورت میں آیا اور اس کا دوسرا پہلو دوسری سورت میں۔ کہیں سوال ایک سورت میں ہے اور جواب دوسری سورت میں۔ کہیں دعویٰ ایک سورت میں اور دلیل دوسری سورت میں ہے۔ بعض اوقات اعتراض ایک سورت میں ہے اور اس کا دفعیہ دوسری سورت میں۔ گویا یہ دونوں سورتیں جوڑے جوڑے کر کے قرآن میں نازل ہوئی ہیں اور یہ جوڑے اسی ترتیب کے ساتھ قرآن پاک میں چلے آرہے ہیں۔

لیکن جب قرآن پاک نازل ہوا تو اس طرح نہیں ہوا تھا۔ نزول میں تو یہ ہوا کہ اگر ایک جوڑا آج نازل ہوا ہے تو دوسرا جوڑا ۲۰ سال پہلے نازل ہوا تھا۔ ایک ٹکڑا آج نازل ہوا ہے تو دوسرا ٹکڑا چودہ سال بعد نازل ہوا۔ اب جب آپ اس موجودہ ترتیب کو دیکھیں تو بتایئے کہ کیا کسی انسان کے لیے یہ ممکن ہے کہ ایک دن بیٹھ کر سوچے کہ میں ۲۳ سال کے طویل عرصے کے دوران میں تھوڑی تھوڑی کر کے ایک کتاب لوگوں کو دوں گا، اس کی یہ ترتیب ہوگی کہ اس کے سات گروپ ہوں گے، بڑی سورتوں کے گروپ کتاب کے آغاز میں ہوں گے۔ چھوٹی سورتوں کے گروپ بعد میں ہوں گے۔ ہر گروپ میں پہلے وہ سورتیں ہوں گی جن کا آغاز نزول مکہ مکرمہ میں ہوگا، آخر میں وہ سورتیں ہوں گی جو مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہوں گی، اور اس میں دونوں سورتوں کے گروپ ہوں گے، اور اس کے جوڑے ہوں گے، اور ہر جوڑے کی جو

سورتیں بعد کی ان کے آپس میں معانی و مطالب میں بڑی مناسبت اور مشابہت پائی جائے گی۔ یہ چیز کسی انسان کے لیے ممکن نہیں ہے۔ بلکہ کسی کمپیوٹر کے لیے بھی ممکن نہیں کہ ۲۳ سال کی اس طرح منصوبہ بندی کر دے کہ مستقبل کی پوری نقشہ کشی اور منظر کشی کر کے دے دے۔

قرآن پاک کی آیات اور سورتوں کے مابین یہ ربط جس کے لیے بے جا طور پر نظم قرآن کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے ایک اہم تفسیری علم سمجھا جاتا رہا ہے۔ متقدمین اور متاخرین دونوں نے اس پر اظہار خیال کیا ہے اور داد تحقیق دی ہے۔ اس ضمن میں جن اہل علم کی تحقیقات قابل ذکر ہیں ان میں امام فخر الدین رازی متقدمین میں اور مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا حسین علی، سید قطب، مولانا حمید الدین فراہی، ان کے شاگرد رشید مولانا امین اصلاحی اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی متاخرین میں قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات نے نظم قرآن کے بارے میں جو اسالیب تحقیق اپنائے ہیں وہ خود اپنی جگہ نہ صرف علم و تحقیق کی نئی نئی دنیاؤں کی ترجمانی کرتے ہیں بلکہ قرآن مجید کے اعجاز کے نئے نئے پہلو سامنے لا رہے ہیں۔ قرآن پاک کے جن مفسرین و محققین نے نظم قرآن کے نئے نئے اسالیب دریافت کئے ہیں ان کی تعداد درجنوں میں ہے۔ یہ تصور کرنا درست نہ ہوگا کہ نظم قرآن، ربط آیات و سورت کے یہ سارے نظام ایک دوسرے سے متعارض ہیں۔ ہرگز نہیں! نہ صرف یہ سب نظام بلکہ آئندہ دریافت ہونے والے دیگر نظام بھی اعجاز قرآن کے محض ایک یا چند پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں۔ یہاں ان سب نظاموں کے تقابلی مطالعے کی گنجائش نہیں ہے البتہ اتنی بات سے قرآن کا ہر قاری (وہ دوست ہو یا دشمن، اپنا ہو یا پرایا، عالم ہو یا جاہل) بہر حال اتفاق کرے گا کہ نظم قرآن کی ان نزاکتوں کا علم نزول قرآن کی تاریخ کے پس منظر میں

معجزات کی ایک نئی کہکشاں کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا کسی بشر کے لیے یہ ممکن نہیں کہ مختلف اور متنوع حالات و واقعات کے ضمن میں آنے والی ہدایات اور تعبیروں کو اس طرح مرتب کردے کہ آخر میں ایک ایسا نقشہ وجود میں آجائے جس کی نزاکتیں، باریکیاں اور عجائب و غرائب لاانتہا ہی دکھائی دیں۔

یہ تو جب ہوسکتا ہے کہ پہلے سے کوئی نقشہ بنایا ہوا موجود ہو، پہلے سے ایک چیز مکمل ہو، آپ ایک موزیک کا کوئی نقشہ اس فرش پر بناتے چلے ہیں اور آپ ایک بچے سے کہیں کہ یہ ٹکڑا ادھر رکھ دو، اور یہ ٹکڑا ادھر رکھ دو۔ اس طرح غیر مرتب انداز میں پتھروں کے ٹکڑے ادھر ادھر رکھواتے چلے جائیں اور ۲۳ سال کے بعد جو نقشہ بنے وہ بڑا خوب صورت ہو، بیل بوٹے بنے ہوئے ہوں اور جیومیٹری کے اصولوں کی پوری رعایت کے ساتھ اس کے نمونے موجود ہوں۔ یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب پہلے سے کوئی نقشہ آپ نے بنا رکھا ہو اور آپ کو ایک ایک ٹکڑے کا پتہ ہو کہ اس کو کہاں رکھنا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کوئی ایسا نقشہ بنا کے نہیں رکھا تھا۔ یہاں تو یکایک ایک شخص آیا اس نے کہا پڑھو، آپؐ اجنبیت کے سبب سے گھر چلے گئے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تو ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ مجھ سے یہ کام لیا جائے گا۔ اگر توقع ہوتی تو حضرت خدیجہؓ وہ کچھ نہ کہتیں جو انہوں نے کہا، وہ تو کہتیں کہ ہاں ہاں ہم تو پہلے سے توقع کر رہے تھے کہ آپ نبی بنائے جائیں گے۔ کہتیں کہ آؤ مل جل کر یہ نیا کاروبار شروع کرتے ہیں۔ اس کے برعکس ان دونوں مقدس شوہر اور بیوی کا جو بے ساختہ ردعمل تھا وہ اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں بالکل خالی الذہن تھے ان کے ذہن میں اس واقعے سے ایک لمحے پہلے تک ذرہ برابر بھی یہ بات نہیں تھی کہ کیا کرنا ہے اور ان سے کیا کام لیا جانے والا ہے۔ خود قرآن مجید میں ہے کہ تمہیں پہلے کچھ پتہ نہیں تھا کہ کتاب کیا ہے

اور ایمان کیا ہے؟ یعنی تمہیں نہ خود کچھ معلوم نہیں تھا! اللہ نے سب سے پہلے تمہیں بتایا!
تو گویا قرآن پاک کی موجودہ ترتیب کا ترتیب نزول سے مختلف ہونا خود اس کی حقانیت
کی دلیل ہے اور جتنا آدمی اس پر غور کرتا چلا جاتا ہے اسی قدر یہ بات ثابت ہوتی چلی
جاتی ہے کہ قرآن پاک اللہ کی کتاب ہے اور اللہ رب العزت ہی نے اس کو نازل کیا
ہے۔

قرآن مجید کی قراءت

جب قرآن پاک نازل ہوا تو عربی زبان میں عام طور سے تحریروں میں نقطے لگانے کا رواج نہیں تھا، زیر زبر پیش اور اعراب کا رواج تو کیا غالباً اعراب کا تصور بھی نہیں تھا۔ اس لیے جب قرآن پاک پہلے پہل لکھا جانا شروع ہوا تو اس میں اکثر و بیشتر نہ تو نقطے لگے ہوتے تھے اور نہ اعراب۔ اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ عربی زبان میں نقطے سرے سے موجود ہی نہیں تھے، بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ عام طور پر ان کو لکھنے کا رواج نہیں تھا۔ بہت سے حروف بغیر نقطوں کے ہی لکھے جاتے تھے اور پڑھنے والے ان کو ٹھیک پڑھتے تھے۔ لکھنے والے بھی ان کو ٹھیک ٹھیک سمجھا کرتے تھے۔

نقطوں کی عدم موجودگی کی صورت میں اس بات کی بہت زیادہ ضرورت پڑ جاتی ہے کہ قرآن پاک کو کسی مستند استاد سے پڑھا جائے۔ اس لیے کہ بغیر نقطوں کے لکھی گئی تحریر کو اگر استاد کی مدد کے بغیر پڑھا جائے گا تو ایک لفظ یا حروف کو ایک سے زائد طریقے سے پڑھنے کا امکان موجود رہے گا۔ مثال کے طور پر فتبینوا ایک لفظ ہے جس کے معنی ہیں تحقیق کرو۔ (یہ لفظ سورۃ الحجرات میں آیا ہے)۔ اس پر اگر نقطے نہ ہوں اور آپ اپنے ذہن اور اندازے سے اس کو پڑھنا چاہیں تو آپ اس کو کئی طرح پڑھ

سکتے ہیں۔ مثلاً فقسیمواہ، جس کے معنی بھی یہی ہیں کہ تحقیق کرو۔ اسی طرح اور کئی الفاظ ہو سکتے ہیں۔

ان حالات میں یہ امکان موجود ہے کہ ایک لفظ کو ایک سے زائد طریقوں سے پڑھا جا سکے۔ اس لیے قرآن پاک پڑھنے پڑھانے میں ہمیشہ سے بنیادی اہمیت اس بات کو دی گئی کہ اس کے متن کو کسی مستند استاد سے سبقاً سبقاً پڑھا جائے، اور استاد اس بات کو یقینی بنائے کہ طالب علم نے قرآن مجید کا متن صحیح طور پر پڑھ لینے کی صلاحیت حاصل کر لی ہے۔ آج تک ایسی کوئی مثال موجود نہیں ہے کہ کسی شخص نے محض قرآن پاک کا مطبوعہ نسخہ دیکھ کر خود ہی اس کو پڑھ لیا ہو اور خود ہی اس کو یاد بھی کر لیا ہو اور یوں وہ قرآن پاک کا مستند حافظ اور قاری بھی بن گیا ہو۔ اگرچہ اب ایسا کر لینا ناممکن نہیں ہے، اس لیے کہ قرآن پاک میں نقطے لگے ہوئے ہیں، زیر زبر لگے ہوئے ہیں، اس کو پڑھنے کا طریقہ معلوم ہے، بڑے بڑے قاری حضرات کے کیسٹس دستیاب ہیں۔ لیکن مسلمانوں میں رواج ہمیشہ سے اس بات کا رہا ہے کہ براہ راست کسی مستند استاد سے قرآن مجید کو پڑھا جائے۔ اور مستند استاد سے پڑھنے کے بعد یہ طریقہ بھی رائج رہا کہ جس شخص سے پڑھا جائے اس سے اس کی سند بھی حاصل کی جائے۔

سند ایک ایسی چیز ہے جو صرف مسلمانوں کے ہاں ہی مروج ہے۔ دنیا کی کسی قوم میں اس انداز سے سند کا رواج نہیں رہا، جس انداز سے مسلمانوں کے ہاں رائج ہے۔ کوئی مذہبی روایت ہو یا غیر مذہبی، کوئی مشرقی قوم ہو یا مغربی، آسمانی کتاب پر یقین رکھتے ہوں یا غیر آسمانی پر، کسی بھی قوم میں سند کا رواج موجود نہیں ہے۔ یہ خصوصیت اور نعمت اللہ رب العزت نے صرف اور صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور آپ کی امت کو عطا فرمائی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی سے جو علم

انسانیت کو پہنچا ہے وہ مکمل سند اور استناد کے ساتھ پہنچا ہے۔ اس کی تعلیم کی ایک ایک چیز اور اس کے ایک ایک لفظ کے بارے میں تحقیق اور قطعیت سے یہ بتایا جاسکتا ہے کہ یہ چیز کس ذریعے سے ہم تک آئی ہے۔ قرآن پاک بھی نسلوں اور قوموں کے غیر منقطع تواتر پر مبنی سند متصل سے ثابت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام ارشادات، فرمودات اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و اعمال بھی سند متصل سے ثابت ہیں۔

جب میں سند متصل کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو میری مراد حدیث کی اصطلاح میں وہ سلسلہ روایت (راویوں کا وہ سلسلہ) ہوتا ہے جو مجھ سے لے کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات گرامی سے جاملتا ہے۔ اگر میں آپ سے کوئی حدیث بیان کرتا ہوں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے یوں فرمایا۔ مثلاً آپ نے ارشاد فرمایا:

انما الاعمال بالنیات (۳۲)

اعمال کا دارومدار نیت پر ہوتا ہے۔

یا مثلاً میں قرآن پاک کی کوئی آیت تلاوت کرتا ہوں کہ اللہ رب العزت نے یہ فرمایا ہے، تو ان دونوں صورتوں میں قطعیت اور یقین کے ساتھ میں آپ سے بیان کرسکتا ہوں کہ یہ بات مجھ سے کس نے کہا ہے یا یہ حدیث مجھ سے کس استاد نے بیان کی ہے۔ میں آپ کے مطالبے پر یہ بھی بیان کرنے کا پابند ہوں کہ ان استاد کا علمی مقام اور اخلاقی درجہ کیا تھا؟ وہ اچھے کردار اور علم میں کس درجے کے انسان تھے؟ ان کا اخلاق کس درجے کا تھا؟ ان کا دین کس درجے کا تھا؟ انہوں نے علم حدیث کی تعلیم کہاں سے حاصل کی؟ ان کے دور کے عام اہل دین کی ان کے بارے میں کیا رائے تھی؟ یہ پوری تفصیل بیان کرنا ضروری ہے اس کے بغیر علم حدیث میں کوئی سند مستند

نہیں ہوتی۔ پھر یہ کہ خود ان استاد صاحب نے کس سے سیکھا، ان کے بارے میں ساری معلومات کہ انہوں نے جس سے سیکھا وہ صاحب کس درجے اور مرتبے کے انسان تھے، ان کا علم وفہم کس سطح کا تھا۔ یہ معلومات درکار ہوں گی۔ علی ہذا القیاس۔

مثال کے طور پر ایک روایت حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے امام شافعیؒ سے سنی، امام شافعیؒ نے یہ روایت امام مالکؒ سے سنی، امام مالکؒ نے یہ روایت امام نافعؒ سے سنی، امام نافعؒ نے اپنے استاد عبداللہ بن عمرؓ سے سنی اور عبداللہ بن عمرؓ نے براہ راست حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنی۔

یہ بات کسی اور قوم کی مذہبی یا غیر مذہبی روایت میں موجود کیا ممکن ہی نہیں۔ آپ عام چیزیں تو چھوڑ دیں۔ خود بائبل کی سند اگر آپ عیسائیوں سے پوچھنا چاہیں تو ان کے پاس اس کی کوئی سند نہیں۔ یہودیوں سے پوچھیں کہ تورات تمہارے پاس کس ذریعے سے آئی ہے تو اس کی بھی کوئی سند کسی یہودی کے پاس دستیاب نہیں ہے۔ صرف مشہور ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی، یا یہ معلومات ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے چار حواریوں نے ان کے بارے میں بیان کی تھیں۔ ان کے قریبی حواریوں نے ان کے بارے میں جو واقعات بیان کیے تھے وہ اب چار انجیلوں کی شکل میں ہمارے پاس موجود ہیں، اس کے علاوہ وہ کوئی سند کسی یہودی یا عیسائی کے پاس موجود نہیں۔ لیکن صرف مسلمان دنیا کی وہ قوم ہے جو اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب ہر چیز، قرآن مجید بھی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات بھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال بھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں معلومات بھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کی معلومات بھی، یہ سب ایک ایک تفصیل کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں اور نہ صرف بیان کر سکتے ہیں بلکہ اس کے راویوں میں سے کسی

بھی آدمی کے بارے میں اگر آپ پوچھیں کہ فلاں آدمی کون تھا تو علم حدیث کے ایک طالب علم کی حیثیت سے میں اس کا پابند ہوں کہ آپ کو مطمئن کروں کہ وہ فلاں شخص تھا، فلاں جگہ پیدا ہوا تھا، فلاں جگہ اس کا انتقال ہوا، اتنا عرصہ اس نے دین حاصل کیا تھا، اس کا کردار ایسا تھا، اس کا تقویٰ اس درجے کا تھا، اس دور کے عام اہل دین اس کے بارے میں یہ رائے رکھتے تھے۔ لہٰذا آپ مطمئن ہو جائیں گے کہ یہ واقعی ایک مستند، باکردار، متقی، قدآور انسان تھا جس نے یہ بات روایت کی ہے۔

یہ چیز اتنی عظیم الشان ہے کہ اس کی اہمیت پر جتنا غور کیا جائے انسان کے تعجب اور ایمان دونوں میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس بات کو بے مثال علمی اہمیت بھی حاصل ہے اور یہ ایک دینی فضیلت بھی ہے۔ ایک تابعی حضرت عبداللہ بن مبارک یا ان ہی کے دور کے کسی اور بزرگ کا ارشاد ہے

الاسناد من الدین

اسناد بھی دین کی ایک بنیاد ہے۔

اگر ہمارے دین میں سند نہ ہوتی تو جس کا جی چاہتا کوئی بات دین کی طرف منسوب کر دیتا، جیسا کہ دنیا کے تمام مذاہب میں ہوا ہے۔ جو کچھ کسی بڑی شخصیت نے کہہ دیا، یا کسی سے منسوب کر دیا گیا، بعد والوں نے اسے اپنے مذہب کا حصہ مان لیا، اور وہ چیز ان کے مذہب میں شامل ہو گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین میں یہ چیز ممکن نہیں ہے۔ جب تک کسی چیز کی براہ راست مستند روایت موجود نہ ہو اس کی نسبت حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دین سے نہیں ہو سکتی۔ جس طرح بجلی کے تار میں کرنٹ آ نہیں سکتا جب تک اس کا سلسلہ براہ راست پاور ہاؤس یا بجلی گھر سے ملا ہوا نہ ہو، بلب میں اس وقت تک روشنی آ نہیں سکتی جب تک اس کی سند متصل پاور

ہاؤس سے تبدیلی ہو۔ مسلمانوں میں بھی ہر چیز اور تعلیم جب تک براہ راست حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے جڑی ہوئی نہ ہو اس وقت تک اس میں دین کی روشنی پیدا نہیں ہو سکتی۔

یہی وجہ ہے قرآن پاک میں اور احادیث میں بالخصوص اور بقیہ دینی و عربی علوم میں بالعموم سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو دی گئی کہ اس کی سند کو محفوظ رکھا جائے۔ اسی لیے اس بات کو ضروری قرار دیا گیا کہ قرآن پاک کو کسی مستند استاد کی مدد سے پڑھا جائے۔ جب تک استاد وہ حضرات نہ ہوں جنہوں نے قرآن مجید کی تعلیم مستند اساتذہ سے حاصل نہ کی ہو اور پھر خود وہ مستند اساتذہ ایسے ہوں جن کا سلسلہ تلمذ ہوتے ہوتے ان تابعین قرا تک جا ملے جنہوں نے صحابہ کرامؓ سے قرآن پاک کی تعلیم پائی تھی اس وقت تک تعلیم مستند نہ کہلا سکے گی۔

جب تک تابعین اور صحابہ کرامؓ کا دور موجود تھا تو اس کی ضرورت پیش نہیں آئی کہ قرآن پاک میں نقطے لگانے کا اہتمام بھی کیا جائے۔ لیکن جیسے جیسے صحابہ کرامؓ کا دور ختم ہوتا چلا گیا اور صحابہ کرامؓ ایک ایک کرکے دنیا سے رخصت ہونے لگے تو اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ عربی زبان کے اس علم کو مزید پختہ کیا جائے اور اس کو اس طرح معیار بند (Standardize) کر دیا جائے کہ کوئی شخص اگر استاد کی مدد اور راہ نمائی کے بغیر بھی قرآن پڑھے تو اس کا امکان نہ رہے وہ کسی لفظ کو غلط پڑھ لے، چناں چہ حجاج ابن یوسف جو ایک مشہور مسلمان منتظم اور عراق کا گورنر تھا اور بنی امیہ کے دور کی ایک مشہور سیاسی شخصیت تھا، اس کے زمانے میں اگرچہ صحابہ کرامؓ اکا دکا موجود تھے،

اور اس دور کو بھی تبرکاً صحابہ کرامؓ ہی کا دور کہا جاتا ہے، لیکن اس وقت ان کی تعداد بڑی خال خال تھی۔ آٹھ دس حضرات دنیا کے مختلف گوشوں میں موجود تھے۔ عام طور پر صحابہ کرامؓ دنیا سے تشریف لے جاچکے تھے اور یہ دور عام طور پر تابعین یا کم از کم تابعین کا دور تھا۔ حجاج ابن یوسف نے صحابہ کرامؓ کے مشورے اور راہ نمائی سے تابعین کی ایک ماہر جماعت کو مقرر کیا اور ان کو یہ ذمے داری سونپی کہ بہت سے نسخے تیار کیے جائیں اور ان سب میں قاعدے کے مطابق نقطے لگائے جائیں۔ چناں چہ اس وقت سے قرآن پاک میں نقطے لگانے کا اہتمام بھی کیا جانے لگا۔

اس واقعے کے کچھ اور عرصے بعد اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ قرآن پاک میں اعراب یعنی زبر زیر بھی لگائے جائیں۔ اعراب اس لیے لگائے گئے کہ اب وہ دور آ گیا تھا کہ حفاظ کی تعداد بھی اب نسبتاً کم ہونے لگی، غیر حفاظ کی تعداد زیادہ ہوتی۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ مسلمانوں میں اکثریت حفاظ کی ہوتی تھی اور تھوڑے لوگ ایسے ہوتے تھے جو غیر حفاظ ہوتے تھے۔ اب اس کے برعکس زمانہ آ گیا۔ اس لیے اس بات کا خطرہ تھا کہ جو لوگ ناظرہ پڑھیں گے ان کو چوں کہ زبانی یاد نہیں ہے، اس لیے ہو سکتا ہے وہ زیر زبر میں غلطی کریں۔ پھر غیر عرب لوگوں کی بھی بہت بڑی تعداد اسلام میں داخل ہو چکی تھی جن کی عربی زبان بڑی کمزور تھی۔ اس لیے زبر زیر کی ضرورت ان کو بھی پیش آتی۔ اعراب دوسری صدی ہجری کے اواخر یا تیسری صدی ہجرت کے اوائل میں کسی وقت لگائے گئے۔

یہ تھی قرآن پاک کی تحریر و تدوین کی مختصر تاریخ۔ یہ ابتدائی تدوین رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر تبع تابعین کے دور آخر تک مکمل ہوگئی۔ یعنی اس دور تک جس دور کے قرا کے ذریعے سے قرآن ہم تک پہنچا ہے اور تسلسل کے ساتھ آیا ہے۔ اس دور تک قرآن پاک کی ابتدائی تدوین وتسوید کا یہ مختصر سا خاکہ ہے۔ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ کس طرح وہ نسخہ تیار ہوا جو آج ہمارے پاس ہے، جس میں نقطے بھی ہیں اور زیر زبر بھی ہیں، اعراب بھی ہیں۔

قرآن کریم کی منزلیں

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جب قرآن پاک صحابہ کرامؓ کو دیا اور جس شکل میں اللہ رب العزت نے اس کو اتارا، اس شکل میں یہ صرف سورتوں کی صورت میں مرتب تھا۔ اس میں ترتیب صرف سورتوں کی تھی۔ سورتوں کے علاوہ کوئی ترتیب نہیں تھی۔ بعد میں صحابہ کرامؓ اپنے اپنے ذوق اور اپنے اپنے معمولات کے لحاظ سے قرآن پاک کی تلاوت کیا کرتے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد یہ ہوتا تھا کہ قرآن پاک کی تلاوت ٹھہر ٹھہر کر کی جائے، بہت غور و فکر کے ساتھ اس کا دور پورا کیا جائے اور ترتیل کا اصول جو قرآن نے دیا ہے اس کو نظر انداز نہ کیا جائے۔

صحابہ کرامؓ میں سے بعض کی کوشش انتہائے ذوق و شوق کی وجہ سے یہ ہوتی تھی کہ جتنی جلدی ممکن ہو قرآن مجید کا دور ختم کرلیں۔ کچھ صحابہ کرامؓ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ روزانہ ایک مرتبہ قرآن ختم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ نے فرمایا نہیں، مہینے میں ایک بار ختم کرو۔ اس پر ایک صحابی نے عرض کیا کہ میرے اندر اس سے زیادہ کی ہمت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا مہینے میں دو بار ختم کرلیا کرو۔ انہوں نے پھر عرض کیا میرے اندر اس سے بھی زیادہ کی ہمت ہے۔ آپ

نے فرمایا کہ اچھا ایک مہینہ میں تین بار کرلیا کرو۔ انہوں نے کہا میرے اندر اس سے بھی زیادہ کی امت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہفتہ میں ایک بار کرلیا کرو۔ انہوں نے کہا میرے اندر اس سے بھی زیادہ کی ہمت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اچھا تین دن میں ایک قرآن پاک ختم کرلیا کرو۔ انہوں نے پھر اصرار کیا لیکن آپ نے فرمایا کہ لیکن اس سے زیادہ نہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی کہ کام آدمی کو وہ کرنا چاہئے جس کو وہ نبھا سکے اور پھر ہمیشہ کرسکے۔ اس مفہوم کو ایک مشہور حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے

خیر الاعمال ادومها وان قل (۳۷)

بہترین عمل وہ ہے کہ جس کو آپ تسلسل سے ساتھ کرسکیں اور زندگی بھر اس کو نبھا سکیں اگرچہ وہ تھوڑا ہو۔

بعض اوقات ایک آدمی وقتی جوش میں ایک کام شروع کردیتا ہے لیکن بعد میں آہستہ آہستہ اس عمل میں سستی آجاتی ہے اور وہ معمول برقرار نہیں رہتا۔ اس لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تلقین ہمیشہ یہی رہی کہ ہر کوئی اتنا کام کرے جس کو ہمیشہ ہمیشہ نبھا سکے۔ چنانچہ قرآن پاک کی تلاوت کے بارہ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ کرامؓ سے ہمیشہ یہی فرمایا کہ اتنا پڑھو جتنا زندگی بھر پڑھ سکو۔ تین روز سے کم میں ختم کرنے کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ناپسند فرمایا۔ اس لیے صحابہ کرامؓ کا عام دستور ایک ہفتہ یا دس دن میں قرآن پاک ختم کرنے کا تھا۔ بعض صحابہ کرامؓ کا ایک مہینے کا معمول بھی تھا۔

حضرت عثمان غنیؓ کا معمول شاید اللہ کی بارگاہ میں بہت مقبول ہوگا۔ ان کا عام معمول ایک ہفتے میں قرآن پاک کی تلاوت ختم کرنے کا تھا۔ چونکہ آپ کا یہ

صحابہؓ اور عشرہ مبشرہ اور خلفائے راشدین میں سے ہیں اس لیے ان کا جو معمول تھا اس کو عام طور پہ بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے بھی اس کو بڑی مقبولیت عطا فرمائی۔ تابعین نے بھی اس معمول کو بڑی پسندیدگی کی ساتھ جاری رکھا۔ چناں چہ آج قرآن پاک کی جو سات منزلیں مشہور ہیں یہ وہی ہیں جو حضرت عثمان غنیؓ کا معمول تھیں اور جن کے مطابق وہ تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ ان کا معمول یہ تھا کہ پہلے دن سورۃ فاتحہ سے لے کر سورۃ النساء کے ختم تک تلاوت فرمایا کرتے تھے۔ دوسرے دن سورۃ مائدہ سے لے کر سورۃ توبہ کے ختم تک تلاوت فرمایا کرتے تھے، تیسرے دن سورۃ یونس سے لے کر سورۃ نحل کے ختم تک، چوتھے دن سورۃ بنی اسرائیل سے سورۃ الفرقان تک، پانچویں روز سورۃ الشعراء سے سورۃ یٰسین تک، چھٹے روز سورۃ الصافات سے سورۃ الحجرات تک اور آخری روز سورۃ ق سے ختم قرآن پاک تک۔ گویا یہ وہ وقفے ہیں جو آج منزل کہلاتے ہیں۔ ان منزلوں کی جو بنا ہے وہ حضرت عثمان غنیؓ کی ڈالی ہوئی ہے۔ اگر ان کو یاد رکھنے کا اشتیاق ہو تو ایک اچھا سا فارمولا ہے جو خود حضرت عثمان غنیؓ ہی کا بیان کیا ہوا ہے۔ آپؓ نے فرمایا یہ لفظ یاد رکھیں فمی بشوق۔ ف سے مراد سورۃ الفاتحہ، م سے مراد سورۃ المائدہ، ی مراد سورۃ یونس، ب سے مراد سورۃ بنی اسرائیل، ش سے مراد سورۃ الشعراء اور و سے مراد والصافات، ق سے مراد سورۃ ق۔

اس تقسیم میں منزل کا لفظ بڑا اہم ہے۔ منزل کے لفظی معنی پڑاؤ کے ہیں۔ انگریزی میں اسٹیشن منزل کو ہی کہتے ہیں۔ جب آپ سفر پہ جا رہے ہوں اور تھوڑی دور تھک کر ایک جگہ ٹھہر جائیں اور وہاں منزل کریں یعنی پڑاؤ ڈال لیں اس کو منزل کہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ نے ان وقفوں کا نام پڑاؤ کیوں رکھا؟ یا ان کو منزل کیوں قرار دیا؟ اس کی دو بڑی وجوہات ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات

سے تشبیہ دیتا ہے۔ اس سفر میں اصل منزل مقصود آخرت کی زندگی ہے۔ اس کی فکر اور احساس ہمیشہ برقرار رہے، اس لیے دنیا کی اس عارضی زندگی کو ہمیشہ سفر ہی سے تشبیہ دی گئی۔ گویا کہ تم سفر پر جا رہے ہو۔ جیسے ایک مسافر اپنی منزل کو یاد رکھتا ہے اور ساری تیاری منزل کی خاطر ہی کرتا ہے، اسی طرح ایک مسلمان کی ساری زندگی مسافرت سے عبارت ہے اور اس کی آخری منزل مقصود آخرت ہے۔ لہٰذا آخرت کا احساس اس کی زندگی میں ہمیشہ تازہ رہنا چاہیے، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بار بار فرمایا کہ ایک مسلمان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک سفر پر جانے والا کہ وہ راستے میں ستانے کے لیے تھوڑی دیر کے لیے ٹھہرا ہے اور جلدی آگے چلا جائے گا۔

اس کو دنیاوی مال و متاع سے اتنی غرض ہے جتنی ایک مسافر کو رستے میں ہوتی ہے۔ مسافر اس بات کی زیادہ پرواہ نہیں کرتا کہ اگر وہ کسی سیٹ پر بیٹھا ہے تو وہ زیادہ آرام دہ ہے یا کم۔ اس پر گرد بھی پڑی ہے تو وہ زیادہ پرواہ نہیں کرتا کہ تھوڑی دور کا سفر ہے۔ وہ جگہ صاف کر کے بیٹھ جاتا ہے، کیوں کہ اس کو جہاں جانا ہے وہاں کے معاملات سے اس کو اصل دلچسپی ہوتی ہے۔ یہی رویہ ایک مسلمان کا زندگی کے بارے میں ہونا چاہیے کہ وقتی طور پر اگر کوئی آرام ہے تو غیر اہم ہے، اور اگر کوئی تکلیف ہے تو وہ بھی زیادہ اہم نہیں ہے۔ اصل اہمیت اس منزل مقصود کی ہے جہاں جانا ہے۔ اس لیے صوفیائے کرام بھی جب کوئی ان کے ہاں تربیت کے لیے جاتا ہے تو اسے سالک کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔ سالک کے معنی بھی چلنے والے کے ہیں۔ صوفیا کے ہاں جو تربیت کے مدارج ہوتے ہیں ان کو مقام کہتے ہیں۔ مقام کا مطلب بھی وہ جگہ جہاں کچھ ٹھہر جائیں اور جہاں ذرا بیٹھ جائیں۔ تو گویا اسلام کی ساری اصطلاحات میں انسانی زندگی کا تصور ایک سفر کا ہے۔

دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلاوت کو بھی اس مسلسل سفر کا ایک مرحلہ قرار دیا ہے۔ جب انسان تلاوت کرتا ہے تو گویا اس سفر میں آگے بڑھ کر ایک منزل طے کر لیتا ہے۔ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

رحم اللہ الحال المرتحل

اللہ تعالیٰ اس مسافر پہ رحمت فرمائے جو منزل پر پہنچ کر سواری کھولتا ہے اور جانور کی پیٹھ پر سے بھی زین یا کجاوہ اتارتا ہے تا کہ وہ بھی آرام کر لے، اور پھر فوراً ہی کجاوہ باندھ لیتا ہے۔ یعنی پھر منزل کا آغاز کر دیتا ہے۔

صحابہ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ اس سے کیا مراد ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ رحمت فرماتا ہے اس قرآن پڑھنے والے پر جو منزل مقصود پر پہنچتے ہی یعنی تلاوت قرآن کا ایک دور ختم کرتے ہی فوراً اگلا دور شروع کر دیتا ہے، اور اسی وقت سانس لیتا ہے جب سورۃ بقرہ کا آغاز کر کے اس کی ابتدائی آیات پڑھ لیتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر حفاظ حضرات جب قرآن پاک ختم کرتے ہیں تو سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات بھی ساتھ ہی پڑھ لیتے ہیں اور آگے جا کر **المفلحون** پر ختم کرتے ہیں۔ یہ وہ اس لیے کرتے ہیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو پسند فرمایا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خود اپنا بھی یہی طریقہ تھا کہ جب ایک منزل ختم ہو جاتی تو فوراً ہی قرآن پاک کا دوسرا دور شروع کر دیتے۔ اسی سنت کے اتباع میں حفاظ کرام بھی ایسا ہی کرتے ہیں تا کہ اس حدیث کی بشارت کے مصداق اور رحمت کے

مستحق بن سکیں۔ چوں کہ انسانی زندگی کو سفر قرار دیا گیا ہے اس لیے حضرت عثمان غنیؓ نے سات وقفوں کو سات منزلیں قرار دیں۔ گویا پورے قرآن پاک کا دور ایک بڑا سفر ہے، اور اس سفر میں جابجا پڑاؤ ڈال رہے ہیں، اور جب سات منزلیں پوری ہو جائیں گی تو سفر بھی مکمل ہو جائے گا۔ یہ ہے منزل کے لفظ کا پس منظر۔

اس کے بعد جب کچھ اور وقت گزرا تو یہ محسوس ہوا کہ لوگوں کے لیے ایک ہفتے میں قرآن پاک کی تلاوت مکمل کرنا بھی مشکل ہوگیا ہے اور لوگوں میں یہ عادت اب ختم ہوگئی ہے۔ شوق کی کمی ہے یا مشاغل کی زیادتی ہے، وجہ جو بھی ہو یہ چیز کم ہوگئی ہے، اور اب عام طور پر لوگ ایک مہینے میں قرآن پاک کی تلاوت مکمل کرتے ہیں۔ اس لیے کچھ لوگوں نے غالباً چوتھی یا پانچویں صدی ہجری میں قرآن پاک کو تیس مختلف حصص میں تقسیم کر دیا۔ ان بزرگوں کے نام معلوم نہیں ہیں جنھوں نے یہ تقسیم کی ہے۔

واضح رہے کہ پاروں کی اس تقسیم کا قرآن پاک کے مضامین سے کوئی تعلق نہیں۔ بل کہ ان حضرات نے قرآن پاک کی آیات اور الفاظ کو گن کر تیس برابر حصوں میں تقسیم کر دیا تاکہ پڑھنے میں سہولت ہو، اور اگر کوئی شخص ایک مہینے میں قرآن پاک ختم کرنا چاہے تو ایک حصہ روزانہ تلاوت کر سکے۔ گویا یہ صرف تلاوت کی سہولت کی خاطر کیا گیا ہے۔ اس کا قرآن پاک کے مندرجات اور اس کی تقسیمات سے کوئی تعلق نہیں۔

اس کے بعد ایک مرحلے پر پھر یہ محسوس ہوا کہ ایسا بھی مشکل ہے کہ لوگ پورے پارے کی تلاوت ایک دن میں کرلیں۔ ایسے لوگوں کی سہولت کے لیے کچھ لوگوں نے ایک پارے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ سعودی عرب کے چھپے ہوئے قرآن پاک میں آپ کو ایک لفظ ملے گا "حزب" جس کے لفظی معنی ہیں ٹکڑا، گروپ یا پارٹی۔

یعنی آیتوں کا ایک گروپ تو گویا ایک پارہ کو دو حزبوں میں تقسیم کر دیا۔ اس طرح ایک شخص اگر صرف نصف پارہ روزانہ تلاوت کر سکتا ہے تو وہ گویا دو ماہ میں قرآن ختم کر لے گا۔

پھر کچھ عرصے بعد ایک حزب کو بھی دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا گویا ایک پارہ چار حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ہمارے ہاں برصغیر میں جو پارے چھپتے ہیں ان میں بھی ایک پارے کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں ربع اور نصف وغیرہ کی اور عرب دنیا میں حزب کی اصطلاح مروج ہے اور اس میں نصف حزب بھی کہا جاتا ہے۔ اس طرح پارے کو سہولت کی خاطر چار حصوں میں تقسیم کر دیا گیا، صرف اصطلاحات کا فرق ہے۔ اس بات کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ اگر ایک غیر عرب تلاوت کرے گا اور ایک چوتھائی پارہ پڑھ کر تلاوت ختم کرے گا تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی ایسی جگہ ختم کر دے کہ جہاں مفہوم کے لحاظ سے اس کو ختم نہیں کرنا چاہئے۔ یعنی یہ نہ ہو کہ معانی مناسب کے لحاظ سے بات ادھوری رہ جائے۔ اس لیے اہل علم نے ان مقامات پر نشانات لگا دیئے ہیں جہاں آپ کو وقف کرنا چاہئے، جہاں ایک دن کی منزل پوری کرنا بہتر ہے۔ یہ کوئی لازمی امر نہیں کہ آپ وہیں منزل ختم کریں۔ اگر آپ قرآن کریم کے مفہوم سے واقف ہیں تو آپ جہاں چاہیں ختم کر لیں۔ لیکن بہتر ہے کہ وہاں ختم کریں جہاں اس کے معانی، مطلب یا تفسیر پر کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔ اس لحاظ سے یہ ذیلی تقسیم کی گئی ہے۔

آپ نے دیکھا ہو گا کہ رمضان المبارک میں پورے قرآن کی تلاوت کی جاتی ہے اور حفاظ ہر زمانے سے بلکہ صحابہ کرامؓ کے دور سے لے کر آج تک پورے قرآن کی تلاوت تین رکعت میں کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ رواج حضرت عمر فاروق

رضی اللہ عنہ کے زمانے سے آج تک جاری ہے۔ مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، مراکش، انڈونیشیا ہر جگہ جاری ہے۔ کہیں کہیں مسلمان آٹھ رکعت بھی پڑھتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر جگہ بیس رکعتیں ہی پڑھی جاتی ہیں۔ دنیائے اسلام میں بہت بڑی اکثریت بیس رکعت پڑھتی ہے۔ اب ایک سوال یہ پیدا ہوا کہ دنیا کے مختلف حصوں میں ایسے حافظ تو موجود ہیں جو قرآن پاک اول سے لے کر آخر تک زبانی سنا دیں۔ لیکن یہ بات کہ وہ سب کے سب عربی زبان بھی بہ خوبی جانتے ہوں، قرآن پاک کی تفسیر سے بھی واقف ہوں، قرآن پاک کا مفہوم بھی سمجھتے ہوں، ایسے لوگ بہت کم تھے۔ غیر عربی داں اور غیر عالم حفاظ کرام تعداد میں بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ عالم حافظ تعداد میں تھوڑے ہیں۔ لہذا ان کو بڑی مشکل پیش آتی تھی کہ جب تراویح میں قرآن پاک پڑھیں اور درمیان میں وقفہ بھی کریں تو اس میں غلطی کا امکان ہوتا تھا۔ یہ بڑے اچھے حفاظ کی نشانی ہوتی ہے جو تراویح میں بغیر غلطی کے قرآن سنا دے۔ ویسے تو بہت سے حافظ بغیر غلطی کے سنا دیں گے لیکن تراویح میں ایسا کرنا آسان نہیں۔ کوئی بہت ہی اچھا حافظ ہوگا تو آسانی سے تراویح میں بغیر غلطی کے سنا سکے گا۔ اس لیے کہ تسلسل کے ساتھ جب آپ پڑھتے ہیں تو آپ کا ذہن کام کرتا رہتا ہے اور آپ پڑھتے رہتے ہیں۔ لیکن جب بیچ بیچ میں وقفے کر کے پڑھتے ہیں تو ہر وقفے کے بعد اس سلسلے کو وہیں سے از سر نو جوڑنا اور تازہ کرنا پڑتا ہے۔ اس میں غلطی کا امکان رہتا ہے۔

گویا حفاظ کرام کے لیے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس بات کا تعین کیسے کریں کہ ایک رکعت میں کتنا پڑھا جائے۔ بعض اوقات قرآن پاک کا مفہوم یا آیات میں زیر بحث بات یا گفتگو ابھی نامکمل ہے اور آپ نے رکوع کر دیا۔ فرض کریں کہ باقی حصہ دوسرے دن پڑھنا ہے تو وہاں سے ادھوری بات شروع ہوگی جو نامناسب بھی ہے اور شاید

خلاف ادب بھی۔ اس کے لیے کچھ حضرات نے (اور غالباً یہ کام برصغیر میں ہوا) قرآن پاک کو اتنے برابر رکوعوں میں تقسیم کردیا کہ اگر روزانہ بیس رکوع پڑھے جائیں تو ۲۷ ویں شب کو قرآن پاک ختم ہو جائے۔ اس حساب سے رکوعوں کی تقسیم کردی گئی اور یہ صرف ہمارے علاقے، یعنی پاکستان، ہندوستان، بنگلہ دیش، افغانستان، وسطی ایشیا وغیرہ میں ہے۔ عرب دنیا میں شاید اس کی ضرورت پیش نہیں آئی کیوں کہ وہ عربی دان تھے اور مفہوم سمجھتے تھے۔ اس لیے جانتے تھے کہ کہاں وقف کریں اور کہاں نہ کریں۔ چناں چہ سعودی عرب اور مصر، شام وغیرہ کے چھپے ہوئے قرآن پاک کے نسخوں میں رکوع کی کوئی نشان دہی نہیں ہے۔ یہ صرف حفاظ کرام کی سہولت کے لیے تھا کہ اس طرح قرآن پاک خود بخود ستائیس ویں شب کو ختم ہو جائے گا۔

یہ قرآن پاک کی مختلف تقسیمیں تھیں جو مختلف علاقوں اور مختلف اوقات میں مروج ہوئیں اور آج تک ہمارے ہاں مروج ہیں۔

تدوین قرآن

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات مبارکہ کے آخری زمانے میں جب آپ ﷺ کی زندگی کا آخری رمضان المبارک تھا، دو مرتبہ جبرئیل امین سے قرآن پاک کے سننے سنانے کا دور کیا۔ یہ دور "عرضہ" کہلاتا ہے، جس کے لفظی معنی پیش کش یا انگریزی میں پریزنٹیشن کے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر حضرت جبرئیل امین نے دو مرتبہ پورا قرآن پاک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے پیش کیا اور دو ہی مرتبہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے صحابہ کرامؓ کو قرآن پاک سنایا۔ ظاہر ہے اس آخری عرضے میں بھی قرآن پاک کا وہی حصہ سنا اور سنایا گیا جو اس وقت تک نازل ہو چکا تھا۔ اس واقعے کے بعد بھی وحی کا نزول جاری رہا، اس لیے کہ آخری عرضہ تو رمضان المبارک میں ہوا تھا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی دنیا سے رحلت اس واقعے کے پانچ چھ ماہ بعد ربیع الاول میں ہوئی۔ اب یہ جو چھ مہینے گزرے ان میں بھی کئی آیات نازل ہوئیں۔ چنانچہ یہ مشہور آیات حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئیں۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ

وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۳-۸)

آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت

تمام کر دی اور میں نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند کر لیا۔

اس آیت کے بارے میں عام خیال یہی ہے کہ یہ سب سے آخری آیت ہے جو نازل ہوئی اور اس کے نزول سے قرآن پاک مکمل ہوگا۔ لیکن یہ خیال درست نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس آیت کے بعد بھی کئی دوسری آیات اور سورتیں نازل ہوئی ہیں۔ چناں چہ حجۃ الوداع کے بعد نازل ہونے والی آیات میں سورۃ النصر بھی شامل ہے، جو ایک مکمل سورت کے طور پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رحلت سے کچھ دن پہلے نازل ہوئی۔

بہ ہر حال یہ امر قطعی اور یقینی ہے کہ قرآن کا نزول حجۃ الوداع کے بعد بھی جاری رہا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ میں بعد میں چل کر یہ سوال پیدا ہوا کہ نزول کے اعتبار سے قرآن کی آخری آیت کون سی ہے۔ یہ سوال اس لیے پیدا ہوا کہ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی آیت کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ اب یہ آخری آیت نازل ہوگئی ہے، اس پر قرآن مکمل ہوگیا ہے اور اب قرآن کا مزید کوئی حصہ نازل نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ اس طرح کا اعلان فرما دینے کے معنی یہ تھے کہ صحابہ کرامؓ سمجھ جاتے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا وقت رخصت آگیا ہے اور اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے جانے والے ہیں۔ یہ چوں کہ اللہ تعالیٰ کی سنت کے خلاف ہے، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں بتایا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال

ہوگیا تو صحابہ کرامؓ کو پتہ چلا کہ نزول قرآن مکمل ہو چکا ہے۔ اب یہ سوال سامنے آیا کہ آخری سورت نزول کے اعتبار سے کون سی تھی۔ اس پر صحابہ کرامؓ نے سوچنا شروع کیا کہ آخری آیت کون سی تھی۔ جس صحابی نے جو آخری آیت سنی تھی اس نے یہ خیال کیا کہ وہی آخری آیت ہوگی۔ اس طرح مختلف آیتوں کے بارے میں مختلف صحابہ کرامؓ کو خیال ہوا کہ وہ آخری آیت ہے۔

یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ اور اہل علم کی خاصی بڑی تعداد سورۃ مائدہ کی مذکورہ بالا آیت کو ہی قرآن پاک کی آخری آیت قرار دینے کے حق میں ہے، کیوں کہ جب حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے اس آیت کے نزول کا اعلان عام فرمایا تو صحابہ کرامؓ کا ایک جم غفیر موجود تھا۔ حاضرین کی بڑی تعداد نے اس کو سنا تو اکثر حضرات کے لیے یہ آخری آیت تھی جو انھوں نے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنی تھی۔ اس کے بعد ان میں سے بیشتر کو حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی زبان مبارک سے پھر قرآن پاک سننے کا موقع نہیں ملا۔ اس لیے ان کا خیال یہ تھا کہ یہ آخری آیت ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے اور قرآن پاک کا اتنا وسیع اور عمیق علم رکھتے تھے کہ صحابہ و تابعین نے آپ کو ترجمان القرآن کا لقب دیا، تفسیری روایات بھی سب سے زیادہ ان سے منقول ہیں۔ ان کی روایت ہے کہ نزول کے اعتبار سے قرآن مجید کی سب سے آخری آیت سورۃ البقرہ کی یہ آیت ہے:

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (۳۹)

ڈرو اس دن سے کہ جس دن تم سب اللہ کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور پھر ہر نفس کو وہ سب پورا ادا کردیا جائے گا جو اس نے کمایا اور کسی پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

اس کے برعکس کچھ اور صحابہ کرامؓ کا خیال تھا کہ سورۃ النصر سب سے آخری وحی ہے، یعنی:

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ وَرَاَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُوْنَ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا (۴۰)

جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے۔ اور آپ نے لوگوں کو دین میں جوق در جوق داخل ہوتے دیکھ لیا تو اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیجئے اور اس سے مغفرت طلب کیجئے بیشک وہ بہت معاف کرنے والا ہے۔

کچھ اور صحابہ کرامؓ کا خیال تھا کہ يَسْتَفْتُوْنَكَ ۭ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيْكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ (۴۱) سب سے آخری آیت ہے۔ ان کے علاوہ بھی بعض اقوال ہیں جن کی تفصیل علامہ جلال الدین سیوطی نے اپنی مشہور کتاب الاتقان فی علوم القرآن میں دی ہے۔

بعض اہل علم نے ان متعدد اقوال کے درمیان تطبیق کی بھی کوشش کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سب سے آخری اعلان تو وہ ہے جو سورۃ المائدہ کی آیت ۳ الیوم

الکملت کی صورت میں حجۃ الوداع کے موقع پر کیا گیا۔ آخری مکمل سورۃ النصر ہے۔ آخری حکم قرآن کا سورۃ بقرہ کی آیت بابت حرمت ربا ہے۔ جب کہ مطلقاً سب سے آخری میں نازل ہونے والی آیت سورۃ البقرہ کی آیت ۲۸۱ ہے۔

بہر حال اس آیت کے نزول کے چند روز بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام دنیا سے تشریف لے گئے۔ نزول قرآن کے اس پورے تیئیس سالہ عمل کے دوران آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن پاک کو ساتھ ساتھ لکھواتے بھی رہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی تاریخ کا ہر طالب علم بخوبی جانتا ہے۔ جوں ہی کوئی آیت نازل ہوتی آپ صلی اللہ علیہ وسلم اسے فوراً کاتبان وحی کو بلا کر لکھوا دیتے۔ جو لکھا ہوا تھا اسے وقتاً فوقتاً سنتے بھی رہتے تھے، اور صحابہ کرام میں سے جو پورے قرآن کے حافظ تھے ان سے پورا اور جن کو جتنا یاد تھا ان سے وہی حصہ جو ان کو یاد تھا وقتاً فوقتاً سنتے اور ان کو سناتے بھی رہتے تھے۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قرآن پاک کی تمام سورتوں اور آیات کو ایک کتاب کی شکل میں اس ترتیب سے یکجا نہیں کیا گیا تھا جس ترتیب اور شکل میں آج وہ ہمارے پاس کتابی صورت میں موجود ہے۔ یعنی ترتیب تلاوت کے اعتبار سے قرآن کے مکمل اور مرتب شدہ نسخے مصحف کی شکل میں تیار نہیں تھے۔ اس وقت کتابت قرآن کی شکل یہ تھی کہ کسی چیز یا محفوظ جگہ پر مثلاً ایک صندوق میں قرآن مجید کے مختلف حصے (آیات اور سورتیں) مختلف اشیا پر لکھی ہوئی محفوظ رہتی تھیں۔ کچھ حصے تختیوں پر، کاغذوں پر، اوراق پر، کچھ اونٹ کی ہڈیوں، یا کسی سلیٹ پر یا پتھر کی تختیوں پر لکھی ہوئی محفوظ کی جاتی تھیں۔

جب ہم یہ کہتے یا روایات میں پڑھتے ہیں کہ فلاں صحابی نے قرآن پاک کو جمع کیا تو اس سے مراد یہی ہوتی ہے کہ انہوں نے کتاب اللہ کی تمام آیات، سورتیں اور اس کے تمام حصے مختلف اشیا پر لکھے ہوئے ایک جگہ کر کے محفوظ کر لیے تھے۔ بالفاظ دیگر ایک بڑے صندوق میں ایک بڑی بوری میں محفوظ کر کے رکھ لیے تھے لیکن ایک کتابی شکل میں جس طرح آج ہمارے پاس قرآن مجید موجود ہے اس طرح اس وقت موجود نہیں تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا جب زمانہ آیا تو ایک مشہور جنگ، جنگ یمامہ میں صحابہ کرامؓ کی بہت بڑی تعداد شہید ہوگئی، یہ جنگ جھوٹے مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کے خلاف لڑی گئی تھی۔ اس جنگ میں مسیلمہ کذاب کو شکست ہوئی لیکن بہت سے حفاظ صحابہ کرامؓ اس جنگ میں شہید ہو گئے۔ ان شہدا میں ۷۰۰ صحابہ کرامؓ وہ تھے جنہوں نے خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے قرآن کو سنا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنایا تھا۔ یہ ایک بڑا صدمہ تھا جس سے صحابہ کرامؓ دو چار ہوئے۔ اس موقع پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بجا طور پر خیال ہوا کہ اگر اسی طرح بڑی تعداد میں صحابہ کرام شہید ہوتے گئے تو ممکن ہے قرآن پاک کا کوئی حصہ اس طرح ضائع ہو جائے یا گم ہو جائے۔ اس لیے فوری طور پر قرآن پاک کو کتابی شکل میں ترتیب تلاوت کے ساتھ مرتب کرنے کا اہتمام کرنا چاہیے تاکہ اس کی ترتیب میں فرق نہ آنے پائے۔ کیوں کہ ہوسکتا ہے کہ بعد میں آنے والوں میں سے کسی سے ترتیب آیات وسورت کے بارے میں کوئی بھول چوک ہو جائے اور اس کے نتیجے میں کتاب اللہ کے مختلف حصوں کی

ترتیب کے بارے میں کوئی اختلاف پیدا ہو جائے۔ لہٰذا ایسے کسی بھی ممکنہ اختلاف سے بچنے کے لیے حضرت عمر فاروق کا خیال تھا کہ قرآن پاک کو ایک کتابی شکل میں محفوظ کرنا چاہیے۔ یہ مشورہ لے کر حضرت عمرؓ خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ مزاج تھا کہ جو کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح کیا ہے وہ میں اسی طرح کروں گا، اور جو کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا وہ میں ہرگز نہیں کروں گا۔ وہ ثانی اثنین تھے، گویا حضور کا ثنی تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اپنے اسی مزاج کے عین مطابق انہوں نے کہا کہ جو کام حضور نے نہیں کیا وہ میں کیوں کروں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کو سمجھاتے رہے، بہت دیر تک گفتگو ہوئی، اور کافی دیر کی گفتگو کے بعد بالآخر حضرت ابوبکر صدیق کو اطمینان ہو گیا کہ یہ کام کرنا چاہیے۔

اب ان دونوں بزرگوں نے حضرت زید بن ثابتؓ کو بلایا جو کاتبان وحی میں نمایاں مقام رکھتے تھے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سیکریٹری بھی رہ چکے تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی غیر قوموں کے ساتھ خط و کتابت وہی کیا کرتے تھے۔ چناں چہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جو تبلیغی خطوط لکھے تھے ان میں بھی بہت سے خطوط حضرت زید بن ثابتؓ ہی کے لکھے ہوئے تھے۔ ان کو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بلایا اور تفصیل سے ان کو بتایا کہ یہ کام ہم کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے بھی وہی جواب دیا جو ابتدا میں خود حضرت ابوبکر صدیقؓ نے دیا تھا یعنی جو کام آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں کیا آپ وہ کام کیوں کرتے ہیں۔ اب یہ دونوں حضرات مل کر ان کو سمجھاتے

رہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ ان دونوں بزرگوں سے بہت کم عمر تھے۔ جب یہ گفتگو ہو رہی تھی اس وقت حضرت زید بن ثابتؓ تقریباً بائیس سال کی عمر کے ہوں گے۔ بہرحال ان دونوں بڑے معمر بزرگوں کے سمجھانے سے بالآخر حضرت زید مان گئے۔ لیکن جب انھوں نے حضرت زیدؓ سے کہا کہ اس کام کو تم کرو گے اور تمھیں یہ کام کرنا ہے تو حضرت زید بہت پریشان ہوئے۔ حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ مجھے ایسا لگا کہ انھوں نے احد پہاڑ اٹھا کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے کی ذمے داری میرے سر پر رکھ دی۔ یعنی اتنی بڑی ذمے داری مجھ پر ڈال دی گئی کہ اگر اس کے بجائے یہ حضرات مجھ سے کہتے کہ احد پہاڑ کو کھود کر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کر دو تو میں تنہا اس کام کو کرنے کے لیے تیار ہو جاتا اور یہ کام میرے لیے نسبتاً آسان ہوتا۔

بہرحال حضرات شیخینؓ کے اصرار پر حضرت زید بن ثابتؓ اس عظیم الشان اور تاریخ ساز کام کے لیے آمادہ ہو گئے۔ خلیفہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی معاونت کے لیے چند ارکان پر مشتمل ایک کمیشن بھی بنا دیا، جو ان صحابہ کرامؓ پر مشتمل تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں کتابت وحی کی خدمت سر انجام دیا کرتے تھے۔ ان حضرات کو اس ذمے داری کے ایک نہایت بھاری ذمے داری ہونے کا پورا اندازہ تھا۔ وہ اس بات کا پورا شعور رکھتے تھے کہ وہ قرآن پاک کو آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کتابی شکل میں مرتب کر رہے ہیں اور یہ کہ آئندہ آنے والے سب مسلمانوں کی فہم قرآن اور تلاوت قرآن کی ذمے داری ان کی گردن پر ہے۔ اس لیے حتی الامکان جو احتیاط ممکن ہو وہ اختیار کی جائے۔ یہ سب حضرات جن

کو یہ ذمے داری سپرد کی گئی، وہ سب کے سب قرآن مجید کے حافظ اور صف اول کے علما میں سے تھے۔ ان میں سے ہر ایک نے خود براہ راست ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن پاک پڑھنا سیکھا تھا۔ خود خلیفہ رسول قرآن کے حافظ اور عالم تھے۔ ان کے قریب ترین مشیر اور رفیق سیدنا عمر فاروقؓ بھی حافظ قرآن تھے۔ خلیفہ رسول کے پاس قرآن پاک سارا کا سارا لکھا ہوا موجود تھا، لیکن کتابی صورت میں یک جا مجلد نہ تھا۔ ان کے سب سے بڑے مشیر حضرت عمر فاروقؓ بھی اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم قرآن تھے، ان کے پاس بھی سارا قرآن پاک لکھا ہوا موجود تھا۔ خود اس کمیشن کے ارکان حافظ قرآن تھے۔ ان حالات میں بہت آسان اور عام بات تھی کہ یہ لوگ اپنی یادداشت سے بیٹھ کر قرآن مجید کا ایک نسخہ لکھ کر تیار کر دیں۔ ان کے پاس عرصے میں پیش کئے ہوئے اجزا قرآن موجود تھے لیکن اس کے باوجود خلیفہ رسول نے ان کو مفصل ہدایات دیں اور انہوں نے کہا کہ آپ یہ کریں کہ آپ سب افراد جس قرآت پر متفق ہوں اور وہ قرأت خلیفہ اور حضرت عمرؓ کے حفظ کے مطابق ہو، پھر سب حضرات کی تحریریں ان کی یادداشتوں کی تائید کریں، اس کے بعد بھی ہر آیت کی تائید دو صحابہ کے حلفیہ بیانات سے ہو جو آ کر یہ حلفیہ بیان دیں کہ یہ آیت ہم نے حضور علیہ الصلوٰۃ السلام کو سنائی تھی اور اسی طرح سن کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے منظور فرمائی تھی۔ پھر ہر آیت کی تائید اور ثبوت میں دو دو تحریریں پیش کی جائیں جن کے بارے میں یہ گواہی دی جائے کہ یہ تحریر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو پڑھ کر سنائی گئی تھی اور آپ نے اس کو اسی طرح منظور فرمایا تھا۔ ایسی تحریر کے دو چشم دید گواہ ہوں جو یہ حلفیہ بیان

دیں کہ یہ تحریر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سنائی گئی تھی اور ہم وہاں موجود تھے جب آپ نے اس کی تصحیح فرمائی اور ہم اس کے گواہ ہیں۔ یہ سب بیانات اور شہادتیں مکمل ہو جائیں تب اس کو لکھا جاتے۔

اس حتی الامکان احتیاطی طریقہ کار کے مطابق انہوں نے قرآن پاک کو لکھنا شروع کردیا اور ترتیب کے ساتھ چند ماہ میں پورے قرآن کی تدوین مکمل ہوگئی۔ اس پورے عمل میں ایک لفظ اور ایک حرف کا بھی کہیں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا، البتہ دو آیتیں قرآن پاک کی ایسی رہ گئیں جن کے بارے میں ایک مشکل سوال پیدا ہوگیا۔ قرآن پاک کی یہ دو آیتیں سورۃ البرأت کی آخری آیات تھیں۔ کمیشن کے ارکان نے کہا کہ ہم سب کو یاد ہے کہ یہ سورۃ برأت کی آخری آیات ہیں، ہمارے پاس جو ذاتی تحریری ذخیرہ ہیں ان میں یہ آیتیں موجود ہیں۔ خلیفہ کو یاد ہیں اور ان کے پاس جو تحریریں ہیں ان میں بھی موجود ہیں۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کو یاد ہیں اور ان کی تحریروں میں بھی موجود ہیں، دو گواہ بھی آگئے انہوں نے حلفیہ بیان بھی دے دیا کہ ہم نے یہ دونوں آیات اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو سنائی تھیں۔ ان دونوں گواہان کی زبانی گواہی کے علاوہ دو تحریری شہادتیں بھی آگئیں لیکن ان میں سے ایک تحریری یادداشت کے تو دو گواہ موجود ہیں، البتہ دوسری تحریری یادداشت کے حق میں صرف ایک گواہی دستیاب ہوسکی۔

اب کسی نے کہا کہ یہ کوئی ایسی اہم بات نہیں۔ کوئی حرج نہیں اگر دوسری دستاویز کے دو گواہ نہیں ہیں۔ لیکن کمیشن نے بالآخر یہی طے کیا کہ جب ایک اصول

طریقہ کار طے ہو چکا ہے تو اس کو نہیں توڑنا چاہیے۔ چنانچہ اعلان کرایا گیا کہ یہ آیت جس جس نے بھی عرصے میں پیش کی تھی وہ آ کر کمیشن کے سامنے گواہی دیں۔ پورے شہر مدینہ میں بھی اعلان کرا دیا گیا، لیکن کوئی نہیں آیا۔ پھر ایک نمائندہ مقرر کیا گیا۔ اس نے گھر گھر جا کر ایک ایک صحابی سے پوچھا کہ جب یہ عرضہ ہو رہا تھا اور یہ دو آیتیں پیش ہوئی تھیں تو کیا تمہارے پاس اس وقت کوئی گواہ موجود ہے۔ اس پر بھی کوئی گواہ نہیں ملا۔ ہو سکتا ہے کہ اتفاقاً ایسا ہوا ہو۔ ممکن ہے کچھ لوگ سفر پر گئے ہوئے ہوں، ممکن ہے بعض گواہان کا انتقال ہو گیا ممکن ہے ایسے بعض صحابہ جو وہاں موجود ہوں، حج پر گئے ہوئے ہوں۔ غرض بہت سے امکانات ہو سکتے ہیں، کئی باتیں ہو سکتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ کوئی آدمی نہیں ملا اس پر کچھ لوگوں نے کہا کہ شہر اور قرب و جوار کی بستیوں میں عام منادی کرائی جائے۔ وہ بھی کرادی گئی۔ دوسرا گواہ نہ ملنا تھا نہ ملا۔ اس پر خلیفہ وقت کے حکم سے جمعہ کی نماز کے بڑے اجتماع میں یہ مسئلہ لوگوں کے سامنے رکھا گیا۔ وہاں کسی نے پوچھا کہ وہ ایک گواہ جو دستیاب ہے وہ کون ہے، اس پر ایک صحابی نے بتایا کہ وہ ایک گواہ خزیمہ بن ثابت انصاری ہیں۔ یہ نام سننا تھا کہ بہت سے حضرات کھڑے ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ارشاد نقل کیا جس سے یہ مسئلہ فوراً حل ہو گیا۔

مسئلہ کیسے حل ہو گیا؟ اس کے لیے ایک واقعہ بیان کرنا ضروری ہے۔ جب یہ بات ہو رہی تھی تو یہ زمانہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انتقال کے آٹھ دس ماہ بعد کا ہے۔ آپ اس زمانے سے ذرا تین چار سال پیچھے جائیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ابھی

جیت تھے، مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا کہ کبھی کبھی شہر سے باہر ٹہلنے یا حالات کا جائزہ لینے کے لیے تشریف لے جاتے تھے۔ کبھی صبح کی نماز کے بعد تشریف لے جایا کرتے تھے اور کبھی عصر کی نماز کے بعد۔ ایسے ہی کسی موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہر سے باہر تشریف لے گئے۔ دیکھا کہ ایک قبیلہ پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ وہاں خیمے لگے ہوئے تھے اور ایک بدو ایک گھوڑا یا اونٹ لیے کھڑا تھا۔ آپ نے پوچھا "یہ جانور بیچتے ہو؟" اس نے کہا جی ہاں بیچتا ہوں۔ قیمت پوچھی، اس نے قیمت بتا دی۔ آپ نے فرمایا چلو میرے ساتھ شہر چلو، میں تمہیں قیمت ادا کرتا ہوں۔ چنانچہ دونوں مدینہ منورہ کی سمت چل پڑے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم آگے آگے چل رہے تھے اور بدو اونٹ یا گھوڑا لیے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ جب شہر میں داخل ہوئے تو لوگوں کو پتہ نہیں تھا کہ یہ جانور فروخت ہو چکا ہے۔ ایک صاحب نے بدو سے پوچھا کہ جانور بیچتے ہو؟ اس نے کہا ہاں بیچتا ہوں! کتنی قیمت دو گے؟ ان صاحب نے کچھ زیادہ پیسے لگا دیے۔ اس پر بدو بولا ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مڑے اور فرمایا کہ یہ جانور تو تم نے مجھے بیچ نہیں دیا تھا؟ اس نے کہا میں نے تو نہیں بیچا۔ اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پھر فرمایا تم سے اتنی قیمت کی ادائیگی کی بات نہیں ہوئی تھی؟ اس نے کہا نہیں۔ اور صاف مکر گیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ اپنی بات دہرائی تو اس نے کہا آپ کے پاس کوئی گواہ ہو تو لائیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حیرت سے ادھر ادھر دیکھا، وہاں تو آپ تنہا ہی تھے۔ یوں اتفاق سے ایک صحابی حضرت خزیمہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کھڑے تھے۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ! میں

گواہی دیتا ہوں کہ آپ نے یہ جانور اس شخص سے اتنی قیمت میں خریدا ہے۔ اس پر وہ بدو خاموش ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قیمت ادا کر دی، مل کر کچھ زیادہ بھی دے دیئے اور جانور لے کے آ گئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خزیمہؓ سے پوچھا میں نے تو تمھیں وہاں نہیں دیکھا! تم کہاں کھڑے تھے؟ انھوں نے جواب دیا، میں تو وہاں نہیں تھا! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھی کہ پھر تم نے گواہی کیسے دے دی؟ حضرت خزیمہؓ نے جواب میں عرض کیا کہ میں روز گواہی دیتا ہوں کہ آپ کے پاس جبرئیل امین آتے اور وحی لے کر آتے، اور یہ کہ جنت و دوزخ موجود ہیں۔ جب میں یہ سب ان دیکھی باتوں کو سچ مان رہا ہوں تو یہ معمولی سی بات کیسے نہ مان لوں؟ اس پر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بڑے خوش ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج سے خزیمہ کی گواہی دو آدمیوں کے برابر مانی جائے گی۔

یہ واقعہ کئی صحابہ کرامؓ نے دیکھا اور سنا ہوا تھا۔ جوں ہی انھوں نے یاد دلایا تو دوسروں کو بھی یاد آ گیا۔ اب لوگوں کو احساس ہوا کہ حضرت خزیمہؓ کی گواہی کو دو آدمیوں کے برابر کیوں قرار دیا گیا تھا۔ شاید اسی موقع کے لیے ایسا کیا گیا ہوا۔ چناں چہ اس ارشاد نبوی کی بنیاد پر ان دو آیتوں کے بارے میں حضرت خزیمہؓ کی گواہی کو دو کے برابر تسلیم کر لیا گیا اور یہ دونوں آیتیں سورۃ توبہ کے آخر میں لکھ دی گئیں۔

اسی طرح قرآن کا پہلا مکمل اور کتابی شکل میں مرتب شدہ نسخہ تیار ہو گیا۔ یہ نسخہ جس کو مشورے سے مصحف کے نام سے یاد کیا گیا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے قبضے میں رہا۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے پاس رہا، ان

کے انتقال کے بعد ان کی صاحب زادی ام المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کی تحویل میں رہا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے لے کر حضرت عثمان غنی کے زمانے تک یہ روایت چلی آرہی تھی کہ عرب کے مختلف قبائل کو اجازت تھی کہ قرآن مجید اپنے اپنے لہجے میں پڑھا کریں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہر زبان میں مختلف قبیلوں اور علاقوں کے لہجے مختلف ہوتے ہیں۔ زبان تو ایک ہی ہوتی ہے، لکھی بھی ایک طرح جاتی ہے۔ لیکن لوگ مختلف انداز میں پڑھتے اور بولتے ہیں۔ امریکہ والے Often کو آف ٹن پڑھتے ہیں لیکن انگریز اس کو آفن پڑھتے ہیں۔ امریکہ Schedule کو اس کے ڈول بولتے اور پڑھتے ہیں، جب کہ انگریز اس کو شیڈول پڑھتے ہیں۔ اس طرح اردو کا معاملہ ہے۔ برصغیر کے بعض علاقوں میں لوگ بجلی کو بجلی پڑھتے ہیں۔ چوں کہ عرب قبائل مختلف علاقوں میں آباد تھے اور مختلف لہجے ان کے ہاں رائج تھے اس لیے آغاز میں ہر قبیلہ اپنے اپنے لہجے میں قرآن پاک پڑھا کرتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ قبائلی عصبیت بڑی شدید ہوتی ہے۔ اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آغاز میں نئے اسلام قبول کرنے والوں کو قریش کے لہجے کا پابند نہیں کیا، جو عربی زبان کا ٹکسالی لہجہ سمجھا جاتا تھا۔ آج ہم اس دور کی قبائلی عصبیت اور کشاکش کا تصور کریں تو صاف اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس ماحول میں عرب کے بدوؤں سے آغاز ہی میں یہ کہنا کہ تم اسلام بھی قبول کرلو اور اپنا لہجہ بھی چھوڑ دو ایک ناممکن سی بات تھی۔ یہ بات ان پر بہت گراں گزرتی اور ممکن ہے وہ قریشی لہجے کو معیاری ماننے سے گریز کرتے اور اصرار کرتے کہ ہمارا اپنا لہجہ بڑا

معیاری ہے۔ اس لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس پر اعتراض نہیں کیا، بلکہ جو جس لہجے میں پڑھتا تھا اس کو اسی لہجے میں پڑھنے کی اجازت دی کہ اپنے ہی لہجے میں پڑھو۔ مثلاً بعض ک کو ش بولتے تھے، بعض ب کو م پڑھتے تھے۔ بعض ال کو ام پڑھتے تھے اسلام لانے کے بعد بھی تلفظ کا یہ اختلاف جاری رہا۔

البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وقتاً فوقتاً توجہ دلاتے رہے کہ قرآن جس لہجہ میں اتارا گیا ہے وہ قریش کا لہجہ ہے اور یہ کہ قریش کا لہجہ ہی معیاری ہے۔ حجاز کے باہر کے صحابہ کرامؓ میں جو جو حضرات تعلیم حاصل کرتے جاتے تھے وہ قریش کا معیاری اور ٹکسالی لہجہ اختیار کرتے جاتے تھے لیکن عام لوگ اور بدویانہ پس منظر کے حامل حضرات اپنے مخصوص قبائلی علاقائی لہجے میں ہی پڑھتے رہے۔ اب جب حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیا تو وہ یہ دور تھا کہ نئی نئی نسلیں اور نئی نئی قومیں اسلام میں داخل ہو رہی تھیں۔ ایرانی، ترکی، رومی، حبشی وغیرہ جو عربی نہیں جانتے تھے وہ روزانہ ہزاروں کی تعداد میں اسلام قبول کر رہے تھے۔ ان نئے مسلمانوں نے جوش و خروش سے عربی زبان سیکھنی شروع کر دی۔ ان میں سے جس نے جس عرب سے قرآن سیکھا اسی کے لہجے میں قرآن پڑھنا شروع کر دیا۔ مثلاً کسی یمنی نے اپنے نو مسلم دوستوں اور شاگردوں کو اپنے لہجے میں قرآن سکھایا تو کسی کوفے والے نے اپنے لہجے میں سکھا دیا۔

حضرت عثمان غنیؓ جب خلیفہ تھے اس وقت مسلمانوں کی فوجیں دنیا کے مختلف حصوں میں مصروف جہاد تھیں۔ آذر بیجان کے علاقے میں بھی اور آرمینیا کے علاقے میں بھی۔ مشہور صحابی حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ بھی آرمینیا کے مجاہدین میں

شامل تھے۔ یہ ایک انتہائی محترم اور معزز صحابی تھے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خاص راز داں سمجھے جاتے تھے، وہ بھی وہاں جہاد میں شرکت فرما تھے۔ ایک دن انہوں نے دیکھا کہ ایک امام نے نماز پڑھائی اور ایک خاص لہجہ میں تلاوت کی۔ نماز کے بعد کئی لوگوں نے امام صاحب کے لہجے پر اعتراض کیا اور کہا کہ تم نے غلط پڑھا۔ امام صاحب نے جواب میں کہا کہ میں نے فلاں صحابی سے قرآن سیکھا ہے۔ جن حضرات نے اعتراض کیا تھا انہوں نے کہا کہ ہم نے فلاں صحابی سے قرآن سیکھا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے اپنے امیر سے کہا کہ مجھے جہاد سے چھ ماہ کی چھٹی دے دیں، میں ضروری کام سے فوراً مدینہ منورہ جانا چاہتا ہوں۔

انہوں نے اسی وقت سواری لی اور سیدھے مدینہ منورہ روانہ ہوگئے۔ کئی ماہ کے سفر کے بعد وہ مدینہ طیبہ پہنچے۔ کہتے ہیں کہ دوپہر کا وقت تھا اور گرمی کا زمانہ تھا۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ ذرا آرام کرلیں پھر امیر المومنین حضرت عثمان غنیؓ سے ملاقات کے لیے جائیں۔ لیکن حضرت حذیفہؓ نے نہ مانا۔ سیدھے حضرت عثمان غنیؓ کے گھر پہنچے۔ وہ پریشان ہوکر نکلے کہ دیکھیں حضرت حذیفہؓ اچانک کیسے اور کیوں آگئے ہیں۔ بولے، آپ تو جہاد پر گئے ہوئے تھے پھر اچانک کیا بات ہوئی؟ انہوں نے جواب دیا امیر المومنین! مسلمانوں کی خبر لیں قبل اس سے کہ کتاب اللہ میں اختلاف پیدا ہو، اور ان کو اختلاف قرأت کا واقعہ سنایا اور کہا کہ یہ انتہائی غلط بات ہے، قرآن کے بارے میں اس طرح کے اختلاف کی اب اجازت نہیں دی جاسکتی۔ آج لہجے کا اختلاف ہے، کل ممکن ہے کوئی اور اختلاف پیدا ہوجائے۔ اس لیے آج ہی اس کا کچھ حل تلاش کریں۔

دونوں حضرات نے بیٹھ کر طے کیا کہ حضرت حفصہؓ کے پاس قرآن کا جو نسخہ ہے اس کو منگوا کر اس کی کاپیاں تیار کروائی جائیں اور تمام دنیائے اسلام کے شہروں میں بھیج دی جائیں۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ کے حکم سے گیارہ نسخے اور (بعض روایت میں یہ آتا ہے کہ سات نسخے) تیار کئے گئے۔ دوبارہ حضرت زید بن ثابتؓ ہی کو یہ ذمہ داری دی گئی۔ چنانچہ ان نسخوں کو بڑے بڑے شہروں میں بھجوا دیا گیا اور یہ اعلان کر دیا گیا کہ جتنے انفرادی نسخے اب تک لوگوں کے پاس موجود ہیں وہ سب سرکار کے حوالے کر دیئے جائیں۔ یہ سب انفرادی نسخے جمع کر کے بعد میں تلف کر دیئے گئے۔

فیصلہ یہ ہوا کہ آئندہ جس کسی کو قرآن کا نسخہ تیار کرنا ہو وہ ان نسخوں سے تیار کرے۔ اور یہ نسخے قریش کے لہجے اور قریش کے رسم الخط کے مطابق تیار کیا جائے۔ چنانچہ آئندہ قرآن پاک کے تمام نسخے سو فیصد اس لہجے اور ہجے کے مطابق لکھے گئے جو حضور علیہ الصلوۃ والسلام کا اپنا لہجہ تھا۔ اس سے قبل سب لوگ اپنے اپنے لہجے کے مطابق لکھا کرتے تھے۔ آپ کو معلوم ہے کہ لہجے کے اختلاف سے ہجے کا اختلاف ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرامؓ سے قرآن پاک لکھتے تھے تو وہ ہجے اور طرز تحریر نہیں پوچھتے تھے۔ ان حالات میں اس کا امکان تھا کہ ایک ہی لفظ کے ہجے مختلف انداز سے رواج پا جائیں۔ یہ امکان اس لئے بھی تھا کہ اس وقت تک عرب میں لکھنے لکھانے کا زیادہ رواج نہیں تھا۔ عرب میں بہت تھوڑے لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ بلاذری کی روایت کو درست مانا جائے تو مکہ میں صرف ۱۷ آدمی نوشت و خواند سے واقف تھے۔ ایسی صورت میں ہجا اور طرز تحریر کی باقاعدہ

Standardization نہیں ہوئی تھی۔ معیاری اور متفق علیہ طرز ہجا کی عدم موجودگی کی
وجہ سے اس کا امکان خاصا تھا کہ ایک ہی لفظ کو مختلف انداز سے لکھنا شروع کر دیں۔ اسی امکان
اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے دیگر ممکنہ خدشات سے بچنے کے لیے قریش کے
لہجے میں قرآن پاک کے یہ سات یا گیارہ نسخے تیار کرائے گئے۔ باقی سب نسخے ضبط
کر کے ضائع کر دیئے گئے اور اعلان کیا گیا کہ آئندہ سب لوگ ان ہی مستند نسخوں کے
مطابق نقلیں تیار کریں۔ چنانچہ اس کے بعد سے تمام نئے نسخے ان اصل نسخوں کے
مطابق تیار ہوئے اور یہ گیارہ نسخے انہوں نے تمام دنیائے اسلام میں تقسیم کر دیئے۔

ان نسخوں میں سے تین نسخے اس وقت بھی دنیا میں موجود ہیں جو اپنی اصلی شکل
میں محفوظ ہیں۔ اتفاق سے مجھے ان تینوں نسخوں کی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی
ہے۔ ایک لندن کے مشہور برٹش میوزیم میں محفوظ ہے۔ دوسرا استنبول ترکی میں ہے، اور
تیسرا ازبکستان کے دارالحکومت تاشقند میں ہے۔ یہ وہ نسخہ ہے جس کے بارے میں
خیال کیا جاتا ہے کہ یہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانے میں تیار ہوا تھا، اور خلیفہ کے
پاس رہتا تھا۔ اور یہی وہ نسخہ ہے جو حضرت عثمان غنیؓ کے ذاتی استعمال میں رہتا تھا۔
جب وہ شہید ہوئے تو وہ اسی نسخے کی تلاوت فرما رہے تھے۔ مشہور ہے کہ ان کا خون
بھی قرآن کے صفحات پر گرا تھا اور اس کی نشانی بھی ان صفحات پر موجود ہے۔ میں نے
خود اس کی زیارت کی ہے۔ تاشقند والا نسخہ حضرت امام شاشی کی مسجد کی ایک لائبریری
میں رکھا ہوا ہے۔

یوں حضرت عثمان غنیؓ نے یہ نسخے تیار کروا دیئے اور یہ سارے نسخے ترتیب میں

ثابتؓ ہی کے لکھے ہوئے تھے۔ انہوں نے جو رسم الخط اختیار کیا تھا آج تک اسی رسم الخط کی پیروی کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور رسم الخط میں قرآن پاک لکھنے کی مسلمانوں نے اجازت کبھی نہیں دی۔ عربی کے عام رسم الخط میں اور قرآنی رسم الخط میں تھوڑا سا فرق ہے۔ مثال کے طور پر قال کا لفظ ہے جو قال کی صورت میں عربی میں لکھا جاتا ہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے کہیں ملا کر قل لکھا تھا۔ اب جہاں انہوں نے کھڑے زبر سے لکھا تھا آج تک کھڑے زبر سے ہی لکھا جاتا ہے۔ اس کی کبھی بھی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔ ایران، توران، عرب، عجم، ہر جگہ قدیم زمانے سے لے کر آج کے زمانے تک اس جگہ قل اسی طرح لکھا جاتا ہے۔ عام عربی تحریر میں اس طرح نہیں لکھا جاتا۔ اس کی وجہ اور حکمت کیا ہے، یہ ہمیں نہیں معلوم۔ ممکن ہے کسی مصلحت سے ایسا کیا ہو یا محض اتفاق سے اس طرح لکھا گیا ہو۔ دو جگہ قرآن پاک میں ایسا بھی ہے کہ ایک حرف زائد لکھا ہے۔ مثلاً سورۃ الذاریات (۲۷ ویں پارے میں) کی آیت نمبر ۴۷ میں بِاَیۡیدٍ میں ایک یاء زائد لکھی گئی ہے۔ ایک ی کے دو نقطے ہیں اور ایک ی کا صرف نشان بنا ہوا ہے۔ حضرت زید بن ثابتؓ نے اس وقت اسی طرح لکھا ہوگا اور آج تک یہ اسی طرح لکھا جا رہا ہے۔ اس طرز تحریر کی حکمتوں پر بہت سی بحثیں کی گئی ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ بھولے سے ایک ی کا نشان زائد لکھا گیا ہو۔ کچھ کا خیال ہے کہ اس میں کچھ مصلحت ہے۔ غرض اس پر بہت سے لوگوں نے غور کیا، اور نئے نئے نکتے نکالے گئے۔

الغرض جس انداز میں حضرت زید بن ثابتؓ نے قرآن مجید لکھا تھا اسی انداز

میں آج سے زمانے تک لکھا جا رہا ہے۔ اس خط کو رسم عثمانی کہتے ہیں اور آج تک اس کی پیروی ضروری قرار دی جاتی ہے۔ دنیا میں قرآن مجید کے جتنے نسخے ہیں وہ ان بنیادی نسخوں کی نقل ہیں جو حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عثمان غنی نے تیار کروائے تھے۔